باقیات حیات

مقدمہ

(فانیؔ کی ولادت ۱۳ستمبر ۱۸۷۹ء تاریخ وفات ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء)

مجھے فانیؔ مرحوم کی محض ہم وطنی کا ہی فخر حاصل نہیں بلکہ عرصہ دراز تک میرے ان کے نہایت خصوصیت کے تعلقات رہے ہیں۔ اور اگر میں یہ کہوں تو کوئی مبالغہ نہیں کہ میں اُن کی زندگی کے بہت سے ایسے حالات سے واقف ہوں جنہوں نے شوکت علیخاں کو فانیؔ بنا دیا۔

یہاں ان کی سوانح عمری لکھنا مقصود نہیں۔ صرف اُن کے اِس مجموعۂ کلام "باقیات فانیؔ" پر ایک سرسری نظر ڈالنا ہے اور اس سلسلہ میں اُس شخص کی زندگی کے صرف وہ واقعات اور اُس کی طبیعت کے صرف اُن رجحانات سے بحث کرنا ہے جس نے ہمیں یہ چیز دی جس کا نام "باقیاتِ فانیؔ" ہے۔
فانیؔ کے متعلق اُس کی زندگی میں اور اُس کے بعد اُس کے دوستوں نے

جن میں بعض نہایت بلند پایہ ادیب صاحب علم وفن، بعض محض شاعر بعض معمولی درجہ کے تعلیم یافتہ، اور بعض بہت کم فہم اور مبتدی، ایسے[۲] اشخاص نے جن کو اُس سے کسی خاص وجہ سے یا بلا سبب فطرتاً کچھ اختلاف تھا، ایسے[۳] اصحاب نے جن کی طبیعت کو مرحوم کے کلام سے طبعی مناسبت تھی، اور ایسے[۴] اشخاص نے جن کو اُس کی طرزِ شاعری سے نفرت تھی، اور ایسے[۵] نقادوں نے جن کو فانیؔ یا طرزِ فانیؔ سے کوئی کسی قسم کا لگاؤ یا اختلاف کچھ نہ تھا بلکہ محض ادبی جائزہ اُس کے کلام کا لینا اور پیش کرنا تھا، سب ہی نے اپنے اپنے رنگ میں لکھا اور دل کھول کر لکھا۔ پروفیسر رشید احمد صاحب (جنہوں نے ابتداً باقیاتِ فانیؔ پر نظر کی) سے لیکر مجنوںؔ گورکھپوری تک (جنہوں نے حال ہی میں "نگار" جنوری سنہ ۱۹۵۰ء میں فانیؔ پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے) فانیؔ پر اچھا اور بُرا کافی لکھا جا چکا ہے اور اگر اس سب کو ایک دفعہ دیکھ لیا جائے تو ایک طالب علم کو فانیؔ کے متعلق خاصی بصیرت حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر شاعری کوئی تاریخ نہیں کہ اس میں مخصوص تاریخوں میں واقع ہونے والے حادثات یا کسی خاص زمانہ یا خاص ملک یا خاص افراد کے وہ واقعات ہی بیان کیے جاتے ہوں جن کے چشم دید گواہ یا شاہد موجود ہوتے ہوں یا رہے ہوں۔ یہاں تو اشاروں اور کنایوں میں ذکر ہوتا ہے جذبات کا، محسوسات کا جو آفاقی طور پر ایک شخص واحد کی شعوری اور بعض اوقات تحت الشعوری دنیا میں

ایک شہابِ ثاقب کی طرح، ایک بجلی کی طرح چمک کر گزر جاتے ہیں۔ جن کا کوئی گواہ و شاہد تو درکنار چند لمحات کے بعد اکثر اُس شخص (شاعر) کو بھی وہم و گمان باقی نہیں رہتا۔ اس لئے فانیؔ کے شعر کے متعلق آج تک جس کسی نے جو کچھ لکھا وہ خود لکھنے والے کی ذاتی پسندِ شعری، اندازِ تحریر، اور مذاقِ طبیعت کا نمونہ تھا، اور جو کچھ میں لکھوں گا وہ حقیقتاً میری رائے اور میرے مذاقِ شعری کا آئینہ دار ہوگا۔ پھر چونکہ طبائع مختلف اور اسی بنا پر مذاق جداگانہ ہوتے ہیں اس لئے ہر شخص کی رائے اور ہر شخص کی پسند ہر شخص کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں ایک واقعی ادیب ایک حقیقی صناع کے شاہکار میں ہر ہر لفظ اور ہر ہر جملہ سے مختلف الّون شعاعیں اور ایسے عجیب و غریب معانی و مطالب پیدا ہوتے ہیں کہ ایک نکتہ رس نظر بھی ایک کیفیت و حالت کے تحت تمام معانی و مطالب کا بیک وقت احساس کبھی نہیں کر سکتی اس لئے ضرورت مقتضی اس کی ہے کہ ان جواہر پاروں کو مختلف روشنیوں میں مختلف نقطہائے خیال سے دیکھا جائے تاکہ اُن سے پیدا ہونے والی مختلف شعاعوں سے لطف اندوزی کا موقع مل سکے۔

اسی خیال کے تحت میں یہ جراٗت کر رہا ہوں۔

فانیؔ کی زندگی کے خارجی رخ کا علم ہر شخص کو ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بدایوں میں پیدا ہوئے اور کھاتے پیتے گھر میں پیدا ہوئے۔

ابتدائے عمر میں تمام اسباب راحت و آسائش ان کو حاصل رہے، وغیرہ وغیرہ
اُن کی اوائل عمری میں مقتدر گھرانوں میں جس انداز پر بچوں کی تعلیم و تربیت
ہوتی تھی اس کا لازمی سا نتیجہ تھا کہ ہر ذہین اور طباع نوجوان شعر کی طرف
رجوع ہو جائے۔ مکتبوں کے طریقۂ تعلیم اور اردو، فارسی اور عربی درسی
کتابوں میں ادبی ذوق کی تربیت کے جو مواقع فراہم تھے وہ جغرافیہ، تاریخ
سائنس، یا اقتصادیات و معاشیات کے لئے نہ تھے۔ تکمیل تعلیم کے زمانہ میں
منطق، فلسفہ اور ریاضیات کی کتابیں زیر مطالعہ آتیں، ظاہر ہے کہ اس
طریق و تربیت سے جس وقت طبیعت میں اصلاح و قبول کی اہلیت بدرجہ
اتم ہوتی ہے اُس وقت تو ادبیات کا درس ملتا تھا اور جب ادبیت طبیعت
میں سمو جاتی تھی تو اُس پر منطق و فلسفہ کا رنگ چڑھایا جاتا تھا۔ جو بچہ مبدا فیاض
سے ذہین دماغ اور فطین طبیعت لیکر آتی اور جن کی فطرت میں علو و کمال ہوتا
اُن کی طبیعت کا جوہر قابل ادبیات کے درس سے جلا پا جاتا اور منطق و فلسفہ
اُس کو جگمگا دیتے۔ ریاضیات کی تعلیم اُس قابلیت اور استعداد کو اس درجہ
پر پہنچا دیتی کہ صحن مکتب سے نکل کر میدان عمل میں داخل ہونے کے وقت فارغ التحصیل
طالب علم کی زبان و قلم سے جو جملہ نکلتا وہ موزوں اور برجستہ جو خیال ادا ہوتا وہ
اعلا اور انوکھا۔ اُس کی طبیعت ایک شاخ گل ہوتی جو ہوا کے خفیف سے خفیف
ارتعاش سے جھومتی اور اس سے پھول جھڑنے لگتے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے

مکٹون نے ابوالفضل وفیضی، مومن و غالب، داغ اور فانی تو پیدا کیے مگر گلیسو، جارج اسٹیفنسن، مارکونی، اڈیسن وغیرہ نہ بنائے۔

غرض کہ اس ماحول میں پرورش پاکر اس فضا میں تعلیم و تربیت حاصل کرکے شوکت علیخاں جب کارزارِ حیات میں آئے تو اُن کی فطرت کا ادبی رخ جگمگا رہا تھا۔ طبیعت کی موزونیت کا پیمانہ چھلک رہا تھا اور خارجی اور داخلی ہر ارتعاش اس پیمانہ کو چھلکا دینے کے لیے کافی اور اُن کو شاعر بنا دینے کو آمادہ تھا۔

عام طور پر جس طرح شاعری کی ابتدا ہوتی ہے، اول اول نوجوان شاعر نے جو کچھ پڑھا تھا اُس کے زیر اثر جو کچھ دیکھا اور سنا اُس کو معینہ اور مقررہ پیمانوں میں نظم کر دیا۔

استعداد علمی نے صحیح اور غیر صحیح، اچھی اور بُری نظم کا فرق سمجھا دیا تھا اور شعر اور نظم میں امتیاز کی اہلیت پیدا کر دی تھی، دماغ میں جوہرِ فطری موجود تھا اس لیے طبیعت خود استاد بنی اور تحت الشعور میں ہر شے کو جس انداز پر دیکھنے اور سمجھنے اور ہر خیال کو جس پرواز پر ظاہر اور بیان کرنے کی اہلیتیں سوئی ہوئی تھیں اُن کو توجہ اور تامل سے بیدار کر دیا۔

ابھی اُن کا یہ مشغلہ ابتدائی منازل میں ہی تھا کہ قدرت نے ایسی صورتیں پیدا کر دیں کہ اگر ایک طرف ان کی آنکھوں میں نم پیدا ہوا تو دوسری طرف ان کا جی اپنی آنکھیں اپنے دل سے لگا لینے کو چاہنے لگا۔ اور طبیعت کے سادہ

ورق پر جذبات کا رنگ چڑھنے لگا۔ اس مرحلہ پر زیادہ تشریح اور مطلق خاموشی یکساں معنی خیز ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ شوکت علیخاں جلد ہی معمولی شاعر سے فانیؔ بننے لگے۔

مجھے بات کو مختصر کرنا ہے اس لئے برسوں کی داستان چند سطروں میں کہنا چاہتا ہوں۔

ایک شخص خلاصے امیر گھر میں پیدا ہوا ہو، طبعاً فراخ دل، فراخ حوصلہ اور فراخ دست ہو، جو ہر شخص کو اپنا سمجھ کر اس پر بیدریغ خرچ کرتا ہو، جو ہر عزیز، دوست اور رشناسا کو اپنے ہی معیار پر دیکھنا چاہتا ہو اور اپنی اس خواہش اور ارادہ پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہو۔ جب ظالم زمانہ اُس پر یہ ثابت کردے کہ حوصلہ کی فراخی نے ہاتھ تنگ کر دیا ہے وہ کہاں تک دل تنگ نہ ہوگا۔ جب تجربہ یہ سمجھادے کہ عزیز سے بڑھ کر غیر، دوست سے زیادہ دشمن اور رشناسا سے بڑا ناآشنا کوئی دوسرا نہیں تو فرمایئے کہاں تک اُس کا دل خون نہ ہوا ہوگا۔

فانیؔ ان تمام مرحلوں سے گزرے، اور ان کا علم پڑھنے، سننے، اور دیکھنے تک محدود نہ رہ کر ظالم زمانہ سے دولت و راحت، خلوص و وفا، احسان مندی اور فرض شناسی کی بے ثباتی اور عدم موجودگی کے تمام تجربے اُن کو ذاتی طور پر حاصل ہوئے، کون اندازہ کرسکتا ہے کہ ایک حسّاس دل پر کیا نہ گزر گئی ہوگی۔ دُنیا جانتی ہے راحت کے بعد تکلیف اور خوشی کے بعد غم کا احساس کتنا شدید

ہوتا ہے۔

نقاد کہتے ہیں کہ فانی کے یہاں غم و الم کے سوا کچھ نہیں۔ اُس کے یہاں امید کی حیات افزائیاں نہیں۔ وہ یاسیات کا امام ہے۔ میں کہتا ہوں ؎

ہائے تم لذت شناس دردِ ناکامی نہیں
ہنسنے والو قیس کا دیوانہ پن بیجا نہ تھا

فانی یاسیات کا امام نہ ہوتا تو کون ہوتا؟

فانی کے اشعار میں غم و الم کی افراط حیات سے نفرت و ابا اور موت کی تمنا اور آرزو کو فانی کی شاعری کا نقص یا کمی سمجھنے والے یا تو ایسے خوش قسمت نوجوان ہیں جن کو زمانہ نے اس احساس کا موقع نہیں دیا کہ جب حادثات ایک شاعر کا دل توڑ دیتے ہیں تو اُس سے نغمہ نہیں کراہ ہی پیدا ہوتی ہے یا پھر ایسے نظریہ کے قائل افراد ہیں جو ہر شاعر کا ایک پیام ہونا ضروری سمجھتے ہیں، اور اُن کی رائے ہیں جو شاعر اپنی قوم اور اپنے اہل زمانہ کو درسِ حیات نہیں دیتا وہ اُس سماج کے جسم کے ایک مفلوج ہاتھ ایک افیون زدہ دل و دماغ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

ہر شاعر کا ایک پیام ہونا ہی چاہیے، اس نظریہ کے قائل بیشتر وہ اصحاب ہیں جو بوجوہ اپنے ادبی مذاق کی تکمیل اپنی زبان اور ادب سے کر لینے سے پہلے مغربی تعلیم سے مستفیض ہوئے اور غیر ملکی مذاق طبیعت اور اجنبی زبان

وکلام کی خصوصیات نے اُن کے معصوم دماغ پر ایسا نقش قائم کر دیا کہ پھر وہ اس پر غور ہی نہ کر سکے کہ آیا یہ نظریہ کس حد تک قابل قبول ہے، اور کہاں، کن حالات میں اس اصول کا قائم رکھنا اور اُس کے تحت بحث کرنا غلط اور ناروا ہوگا۔

میں اس بحث کو اس موقع پر طول دینا نہیں چاہتا، صرف چند اشارات ضروری خیال کرتا ہوں۔

آپ اُردو، اور فارسی ادب کی خوب چھان بین کیجئے۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک کہیں یہ بحث نظر نہ آئے گی کہ کس شاعر کا کیا پیام ہے۔ شاعر کا رنگ سخن شاعر کی خصوصیات، شاعر کا اندازِ کلام، شاعر کا مذاقِ طبیعت یہ سب الفاظ آپ کو نظر آئیں گے۔ مسلسل کلام کے سلسلہ میں یہ بحث بھی ملے گی کہ فلاں بحث پر شاعر کیا کہنا چاہتا تھا اور وہ اُس میں کس حد تک کامیاب ہوا یا ناکام رہا۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، نوحہ، تہنیت نامہ، سہرا، واسوخت، قطعہ، رباعی وغیرہ سب کلامِ مسلسل کے تحت آسکتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر پیام کا تعلق ایک سلسلۂ کلام تک تو باقی رہتا ہے اور درست بھی ہے مگر ایک شاعر کی پوری زندگی سے یا اُس کی ذات سے پیام کی بحث کو متعلق کرنا کس حد تک درست ہو سکتا ہے یہ قابلِ غور بات ہے۔

اگر ایک شاعر نے اپنی شعری زندگی میں ایک ہی موضوعِ سخن پر اپنے

کلام کو محدود رکھا ہو، خواہ اُس نے اپنے اظہارِ خیال کے لئے مختلف اصنافِ سخن کو ذریعہ بنایا ہو اُس حالت میں بھی ہم اس سوال پر اعتنا کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی مخاطب جماعت کو کیا پیام دینا چاہتا ہے مگر جس نے کُل ایک ہزار برس پرانی تاریخ کا ایک واقعۂ رزم پیش کیا ہو اور جو آج ایک دوسرے عہد کا ایک قصۂ بزم سنائے۔ جس نے اپنے کلام کو ایک ہی موضوع یا ایک ہی بحث تک محدود نہ رکھا ہو اور جس نے مختلف مباحث پر کلام کیا ہو اُس کے پیام کا تعین کیا؟ اس تنگ خیالی کا اصل سبب یہ ہے کہ جس اُستاد نے اپنے شاگردوں کو یہ خیال دیا اُس بیچارہ کے یہاں ایسی کوئی صنفِ کلام ہی نہ تھی جس میں پیام کی وسعت دو مصرعوں تک محدود ہو اور جس میں ایک شاعر کو حق ہو کہ مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کر سکے۔

فانیؔ اسی صنفِ کلام یعنی غزل کے شاعر تھے۔ ہر شعر میں اُن کا پیام موجود ہے اور ہر پیام ہمارے لئے ایک درس۔

فانیؔ کے بعض دوستوں نے اس کو اس اعتراض سے بچانے کے لئے کہ غزل میں خیالات کی ہم آہنگی نہیں ہوتی ایسی کوشش پر اپنا وقت ضائع کیا ہے کہ اُس کی غزلوں پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا اور اُس کی بیشتر غزلیں ایک سطحِ خیال پر لکھی گئی ہیں اور ان میں ہم آہنگی موجود ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس کاوش کی ضرورت ہی کیا ہے جیسے کہ جوشؔ کی نظم یومِ بہار اور آرزوئے مُحرم میں کوئی

ہم آہنگی نہیں ہے۔ اور نہ اس کی ضرورت ہے اس لیے کہ دو مختلف خیال بجائے خود نظم کیے گئے اور وہ اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہیں اسی طرح غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک نظم ہے اور اس لیے ہرگز ضروری نہیں کہ دو شعروں میں ہم آہنگی ہو۔ ایک غزل مختلف نشستوں میں، مختلف اوقات میں، اور مختلف کیفیتوں کے تحت کہی جاسکتی ہے، اس لیے اُس کے اشعار کا باہم ہم آہنگ نہ ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تنگ خیال لوگ ایسے پوچ اعتراضات سے یہ چاہتے ہیں کہ ایک زبان کے ادب سے ایک مخصوص انداز بیان یا اس کے فن سے ایک صنف کلام خارج ہو جائے۔

روبہ مطلب فانی کو پہلا تجربہ تو اپنی تمام دنیوی مال و دولت اپنے بزرگوں کے ترکہ کے تلف و ضیاع کا ہوا۔

کھلی آنکھ جب نشۂ عیش اُترا یہ خاکستر اب دیکھ کر رو رہا ہوں

بہاراں میں یہ ہوش ہی کب رہا تھا کہ جلتی ہے کیا شے کہاں آشیاں تھا

وہ بیدریغ خرچ کرنے والا نہ صرف تنگدست تھا بلکہ اُس نے دیکھا کہ آج اُس کا نہ کوئی عزیز ہے نہ دوست، نہ یگانہ ہے نہ شناسا ہر شخص غیر تھا اور اجنبی۔ وطن وطن نہ تھا۔ گھر گھر نہ تھا۔ اس حادثہ نے اُس کا دل توڑ دیا

وہ جو دنیا اور متاعِ دُنیا، وطن وارباب وطن، اعزا واحباب دوست و آشنا ہزاروں پھندوں کا ایک جال اُس کے گرد تنا ہوا تھا وہ سب پھندے یکلخت ٹوٹ گئے۔ اُس نے اپنے آپ کو، اپنی ذات کو تنہا اور ہر شے سے غیر متعلق پایا، اور اس احساس نے اس کو ہر شے سے ناامید، مایوس، اور متنفر کر دیا۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا اول تو مکتب کی تعلیم اور خاندانی تربیت نے ایک حد تک شوکت علیخاں کو فانی بننے میں مدد دی۔ اُس کے بعد دوسرا سبق یہ تھا جو زمانہ نے ان کو دیا اور اس عظیم قربانی، اس نقصانِ مادی و روحانی نے فانی کی تکمیل کو تقریبًا دو تہائی پورا کر دیا۔

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا اس نقصان سے ایک فائدہ بھی پہنچا اور وہ یہ تھا کہ اب فانی کو اپنی ذات کے عرفان کا احساس پیدا ہوا۔ اس احساس کی صحیح تعبیر ہم ایگوازم[1] (Egoism) سے کر سکتے ہیں۔

---

[1] ادیبِ فاضل پروفیسر رشید احمد صاحب نے اپنے دیباچہ میں اس مفہوم کو لفظ انا سے ادا کیا ہے، اور شان کے لفظ سے ترکیب دیکر ایک حد تک اپنے مافی الذہن کو ادا بھی فرما دیا ہے مگر ہماری زبان میں لفظِ انا ء کے ساتھ جو ایک ناخوشگوار مفہوم وابستہ ہے وہ کُلًّا دور نہیں ہوتا۔ اور اسی وجہ سے میرے خیال میں یہ لفظ اس مفہوم کو واضح اور منتقل کرنے کے لئے موزوں نہیں۔

فانی کے کلام کا مطالعہ اس بات کو پوری طرح واضح کر دے گا کہ اُن کا یہ احساس اُن کے کلام کو اُن کا خاص رنگ دینے میں بڑی حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ اس حادثۂ زندگی نے فانی کے کلام کو نہ صرف افراطِ رنج و غم سے معمور کر دیا بلکہ اُن کے کلام کی متانت، حکیمانہ نقطۂ نظر اور اپنے غم و الم کو اس طریق پہ بیان کرنا جیسے وہ کائناتِ بشری کا رنج و غم ہے یہ الفاظِ رائج الوقت اُن کے کلام کی "آفاقیت" اسی عطیہ کا نتیجہ ہیں۔

ہماری تاریخ میں جو واقعی بڑی ہستیاں گزری ہیں اُن کے سوانح حیات پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کی نشو و نما میں فطرت کا مخصوص ہاتھ کام کر رہا ہو۔

شوکت علیخاں کو قدرت چونکہ مکمل طور پر فانی بنانا چاہتی تھی اس لئے ان کے متعلق جو بات ہوئی وہ خاص ہی انداز کی ہوئی۔ میں مجبور ہوں کہ تفصیل نہیں کر سکتا مگر چونکہ فانی اور کلامِ فانی کو سمجھنے کے لیے اس کی ضرورت ہے اس لیے اشارتاً عرض کرنا لازمی بھی سمجھتا ہوں۔

ہمارے اخلاقیات نے ایک ذات کی دوسری ذات سے والہانہ محبت کے بالتصریح ذکر کو معیوب سا قرار دے رکھا ہے۔ ہمارے ادب پر اس کا ایک نتیجہ تو یہ مترتب ہوا کہ چونکہ مخاطب بلا واسطہ اور مقصودِ محبت کے نام کے ساتھ نہ رہا اس لئے کلام کا والہانہ پن اور وہ جوش جاتا رہا جو عربی وغیرہ زبانوں میں

نظر آتا ہے۔ یہ تو ہوئی صورت ادبی نقصان کی۔ دوسری شکل اس اندازِ کلام کی، یا بالواسطہ مخاطبت کی یہ رونما ہوئی کہ کلام میں مخاطب کی تخصیص نہ ہونے سے مفہوم اور معانی میں وسعت اور سامع کے لیے اس کی گنجائش پیدا ہوگی کہ وہ شاعر کے مخاطبِ صحیح کے بجائے جس ذات سے اس کے دل کو لگاؤ ہو اس کا تصور پیدا کر کے لطف اندوز ہو سکے۔ فارسی اور اردو ادب میں جس قدر تصوّف سمجھا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ بھی اسی عدمِ تخصیصِ مخاطبت کا نتیجہ ہے۔

اُردو، فارسی کے اکثر شعرا کے مقصودِ محبت کا ہم کو علم ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ جس شاعر کے متعلق ہم کو جس حد تک اس کا علم ہے اُسی حد تک ہم اُس کے بالکنایہ کلام سے حظ بھی زیادہ اٹھاتے ہیں۔

مقصودِ محبت کا حاصل ہو جانا محبت کی موت ہے، اور اس اضطراب کی تسکین عاشق کی نامرادی۔ جو شخص جس قدر زیادہ حساس ہوتا ہے اُسی نسبت سے اُس پر اس جذبہ کا ردِّ عمل بھی شدید ہوتا ہے۔ جس فضا میں ہر شباب پر حسن طاری ہوتا ہو اور ہر حسن پر شباب فانی جیسے آشفتہ مزاج اور والہانہ طبیعت شخص کو — جس کو وطن نے اور جس نے وطن کو پہلے ہی خیر باد کہہ دیا ہو، جس کو زمانہ اور اہلِ زمانہ نے اور جس نے خود کو زمانہ اور اہلِ زمانہ سے ہر تعلق سے آزاد کر رکھا ہو اپنی موت یعنی اپنی زندگی کو ڈھونڈنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہ تھی، راہ میں جس پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرتے شیشۂ دل چکنا چور ہو جاتا۔

مگر فطرت کو تو منظور یہ تھا کہ ع

لبس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

کہنے والے فانیؔ کو ایسے پہاڑ سے ٹکرایا جائے جو شیشہ کو توڑ ہی نہ سکتا ہو بلکہ خود بھی شیشہ سے ٹوٹ جانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ فانیؔ اس مرحلہ پر بھی کامیاب رہے ع

درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اور وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے ؎

نگاہِ اولیں سے جو خلش دل میں ہوئی پیدا

بحمداللہ وہ باقی نگاہِ واپسیں تک ہے (ضیار)

فانیؔ نے شعوری طور پر کبھی نہ چاہا کہ یہ آگ بجھ جائے اور یہ اُن کی فطرت کے خلاف بھی ہوتا۔ نہ صرف یہ کہ اضطراب نے تسکین حاصل کرنا نہ چاہی اور ہمیشہ یہی چاہا کہ ع

جو میں منزل پہ جا پہنچوں تو منزل دور ہو جائے

بلکہ تسکین نے اضطراب کو باقی رکھنے کے لئے خود کو فنا کر دیا، یہ تھا تیسرا سبق جو شوکت علیخاں کو دل سے ملا۔ اور اُس نے فانیؔ کی تکمیل کر دی۔ اقبال نے کس قدر صحیح بات کہی ہے ؎

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گُل ہی نہیں جو خزاں نادیدہ بلبل ہو وہ بلبل ہی نہیں

اس مرحلہ پر میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر فانیؔ رنج و غم کے علاوہ کچھ اور بیان کرتا، زندگی سے بیزاری اور موت کی خواہش کا اظہار نہ کرتا، ناامیدی اور یاس اُس کے کلام سے نہ ٹپکتی تو کیا آپ اُس کو اُس حالت میں قابلِ اعتنا سمجھتے؟ کیا وہ ایک مضحک ایکٹر بن کر نہ رہ جاتا کتنا بڑا ظلم ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ایک بسمل جو زخموں سے چُور تڑپتا، اور کراہتا ہے وہ آپ کو کوئی دلکش نغمہ سنائے۔ آپ کی شان میں قصیدے پڑھے۔ آپ ہر شے اور ہر عمل میں اپنی افادیت کا پہلو کیوں چاہتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہی رنج و غم جو آپ کے عیش و مسرت میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے کسی مظلوم کے لیے باعثِ تسکین بھی ہو سکتا ہے۔

مختصراً یہ تھے وہ حادثات جنہوں نے مِل جُل کر شوکت علیخاں کو فانیؔ بنا دیا۔ اور موروثی فراخ حوصلگی اور فراخ دلی میں ان پے درپے مادّی روحانی، دلی اور دماغی صدمات نے دُنیا اور متاعِ دُنیا سے نفرت، ہر شے سے بے دلی، اور بے زاری، زندگی کی ہیچ اساسی اور موت کی ہمہ گیری، خیال میں حکمت اور فلسفہ کا رجحان، دماغ میں غور اور تامل کی عادت، طبیعت میں سنجیدگی اور متانت اور دل میں انتہائی غیرت اور خودداری پیدا کر دی۔

بات اس نوبت پر پہنچی ہے تو ایک واقعہ سُن لیجئے۔ فانیؔ آگرہ میں ہیں، کہنے کو

وکالت کرتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ بار ہیں اگر کسی دوست سے کوئی بات کر رہے ہیں تو مقدمہ بھلے ہی خارج ہو جائے وہ چند پیسوں کے حصول کے لئے احباب کی صحبت کو ترک کرنا فعل رکیک سمجھتے ہیں۔ اہل و عیال کا بار سر پر ہے اور تنہا ذریعۂ آمدنی کی یہ صورت۔ کیا مجال کہ فانیؔ مخصوص احباب سے بھی اس بارہ میں ایک حرف کبھی زبان پر لائیں۔

مہاراجہ گوالیار کے اتالیق اُردو کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے چاہا کہ فانیؔ گوالیار آجائیں۔ فانیؔ کے علم و اطلاع کے بغیر اس بارہ میں تحریک شروع کر دی۔ نواب سر سلطان احمد خاں مرحوم جو ان سال مہاراجہ کی تعلیم و تربیت کے نگراں تھے۔ اُن سے میں نے فانیؔ کا غائبانہ تعارف اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے شخص تھے۔ اور ایک مشہور ادیب (نواب غلام احمد خانصاحب احمدی) کے بیٹے۔ میری تجویز کو پسند فرمایا اور فانیؔ سے ملنے کی خواہش کی۔ میں نے فانیؔ کو بلایا اور نواب صاحب ممدوح سے ملا دیا۔ جب تمام مراحل طے پا گئے تو میں نے فانی سے اس کا ذکر کیا۔ کچھ سوچ کر بولے کہ "تمہاری اگر یہی خواہش ہے تو بہتر ہے۔ مگر بھائی یہ راجہ لوگ انسان کو انسان نہیں سمجھتے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن کوئی اختلاف یا بدمزگی پیدا ہو جائے اور تمہارے انتخاب پر حرف آئے"۔ میں نے ہر طرح اطمینان کر دیا تو کہا "اچھا اب ایک دفعہ اس علم کے بعد میں نواب صاحب سے گفتگو کروں"۔ میں نے

اس کا بھی انتظام کر دیا تو نواب صاحب سے مل کر تفصیلات معلوم کیں اور آخر میں یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ "میرے نزدیک تنخواہ کا سوال قابل لحاظ نہیں، عزت نفس کا پاس لازمی ہے۔ اس لیے میں اس شرط پر آسکتا ہوں کہ جو مراعات انگریز اتالیق کے ساتھ روا رکھی جاتی ہیں وہی اور وہ سب میرے ساتھ برتی جائیں۔" یہ ذرا دشوار تھا۔ مگر اس خوددار انسان نے اپنی حالت کا پورا احساس اور اپنی ذمہ داریوں کا علم ہوتے ہوئے خودداری پر ذرا سا بھی صدمہ گوارا نہ کیا۔ اور کیونکر کرتا؟ اس لیے کہ فانیؔ شاعر تھا یعنی انسان! کیا میں ان دو لفظوں — شاعر۔ اور انسان — کی معنویت کی تشریح کر دوں؟

یہ تو ہر شخص مانتا ہے کہ پیغمبر انسان کامل ہوتا ہے اور شاعر بلند ترین انسان غالبؔ نے اس بات کو اپنی شوخیٔ طبیعت کا رنگ دیکر یوں کہہ دیا۔ "شاعری پیغمبری است و ہر کہ شاعر نیست خر است۔" بہر حال اُن کا مطلب اس جملہ سے اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ بغیر شاعری کے مرتبہ پر فائز ہوئے ع

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اس بحث کے طول و اختصار کا نتیجہ یہی ایک ہے کہ کسب و تربیت جب ایک بشر کو انسانیت کے بلند مرتبہ پر پہنچا دے کہ پھر اُس کے آگے ترقی کی گنجائش باقی نہ رہے تو وہ شاعر کے درجہ کے قریب پہنچ جاتا ہے، اور جب اس نتیجہ کسب و تربیت کی روح و دماغ پر مبداء فیاض سے قطرات فیض کی بارش ہوتی

ہے تو وہ شاعر بن جاتا ہے۔ گویا شاعر انسان کامل اور انسان کی درمیانی کڑی ہے۔ یہ ہے مرتبہ شاعر کا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ فانی فطرتاً بہت بلند مرتبہ شاعر تھا اور اسی نسبت سے بہت اونچے درجہ کا انسان اور یہ بات وہی خوب سمجھ سکتے ہیں جن کو اُس کا قرب روحانی حاصل رہا ہے۔

یہاں تک تو ذکر ہوا "باقیاتِ فانی" کے مصنف کا۔ اب اس علم اور روایت قفقیت کے بعد یہ دیکھئے کہ جس ذات کی تکمیل فطرت نے اس اہتمام سے کی اُس کا "کارنامۂ حیات" آیا اُس کی داخلی کیفیات کا آئینہ دار ہے؟ یا کسی خارجی اثر کا نتیجہ؟ —— یہ اشعار رواجاً مشاعروں میں داد حاصل کرنے اور استعداد علمی کو ظاہر کرنے کے لئے کہے گئے ہیں یا دل کی تہ میں کھولتے ہوئے مادّہ سے پھوٹ نکلنے والا چشمہ ہے۔ جو زمانہ اور اہلِ زمانہ کی پسند و ناپسند اور داد و بیداد سے بے نیاز ہے؟

یہ طریقہ اب ایک رسم یا رواج کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ جہاں کسی واقعی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنا یا دیباچہ لکھنا ہوتا ہے اُس میں ایک باب شعر و شاعری سے بحث کا ضرور شامل کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ میں ایک فرسودہ پن ضرور پیدا ہو گیا ہے مگر اس سے ایک فائدہ یہ ضرور رہتا ہے کہ نقاد اس سلسلہ میں اُن پیمانوں کو اُن قدروں کو معین اور متعین کر دیتا ہے جن پر وہ زیرِ تبصرہ کلام

کو جلا بخشے گا۔

مجھے اس بارہ میں بھی کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ فانیؔ کی شعر و شاعری کے سلسلہ میں بعض مستند اور مقتدر ادیبوں نے بہت معقول طریقہ پر اور کافی تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال فرما دیا ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر رشید احمد صاحب نے تبصرۂ کلام سے پہلے پورا ایک باب اس پر تحریر فرمایا ہے۔ قبل اس کے کہ شعر کے متعلق میں اپنا خیال ظاہر کروں غیر مناسب نہ ہوگا اگر میں سرسری طور پر یہ بیان کر دوں کہ مجھے ان بیانات سے کہاں تک اتفاق ہے اور کہاں نہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پروفیسر رشید احمد صاحب نے جو اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ بے شک و شبہ بڑی قابلِ غور بحث ہے اور اس میں بہت کارآمد اور مفید باتیں بیان فرمائی ہیں مگر شاید یہ میری کم استعدادی ہے کہ میں بعض نکتوں پر اُن کا ہم خیال نہیں۔ مثلاً آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "شاعری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کم از کم ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور ہو" یہ کہنا تو درست ہو سکتا ہے کہ شاعر کو جتنی زیادہ زبانوں کے ادب پر عبور ہوگا اُتنی ہی اُس کے دماغ میں وسعت، بیان میں شگفتگی، خیالات میں ندرت اور کلام کے مطالب و معانی میں نیرنگی زیادہ ہوگی مگر ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور ضروری ہرگز نہیں اور نہ اس سے کوئی نقص پیدا ہوتا ہے۔ عربی کے ایامِ جاہلیت کے مشہور شعرا کس کس زبان پر عبور رکھتے تھے؟ اور ایسا

نہ ہونے سے اُن کے کلام میں کیا نقص پیدا ہو گیا ؟

(۲) اسی سلسلہ میں پروفیسر صاحب نے ترقی یافتہ زبانوں میں افغانی کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ بالکل نیا انکشاف ہے جو اس مقدمہ سے باہر کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

(۳) پروفیسر صاحب شاعر کی تعریف فرماتے ہیں "شاعر وہ ہے جو حقیقت کو برافگندہ نقاب کرنے میں بیک وقت صداقت، جرأت، اور صناعت کو بروئے کار لا سکتا ہو" صاحبِ موصوف نے جس طرح صداقت، جرأت، اور صناعت کی تعریف کر دی ہے کیا اچھا ہوتا کہ حقیقت کو بھی سمجھا دیتے کہ حقیقت کسے کہتے ہیں۔ ایک طالبعلم یہ پوچھ سکتا ہے کہ وہ شخص جو اپنے کسی خیال کو خواہ وہ حقیقت پر مبنی ہو یا نہ ہو برافگندہ نقاب کرنے میں بیک وقت صداقت، جرأت، اور صناعت کو بروئے کار لا سکتا ہو کیا شاعر کی تعریف پر پورا نہیں اُترتا ؟ ہمارے سامنے ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بجائے حقیقت کو برافگندہ نقاب کرنے کے کتمِ حقیقت اس صناعت سے کیا گیا ہے کہ ہم اُس کارنامہ کو شعر ہی کہہ سکتے ہیں اور حقیقتاً وہ شعر ہے۔ علاوہ ازیں شاعر کے لیے محض حقیقت ہی کو برافگندہ نقاب کرنے کی شرط کیوں لگائی جاتی ہے۔ میرے خیال میں حقیقت کا لفظ اس موقع پر صحیح استعمال نہیں ہوا۔ اور وہ معنی و مفہوم کو محدود کر دیتا ہے۔ بجائے حقیقت کے مافی الضمیر کا لفظ ہونا چاہیے تھا۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے اور اگر اس نقطہ پر تھوڑا سا

تامّل کیا جائے تو ممکن ہے بعض اہلِ نظر اس سے اپنے خیال کو ہم آہنگ پائیں کہ کسی خیال یا مافی الضمیر کو برافگندہ نقاب کرنے کی بھی شرط غیر ضروری ہے۔ جن کا مطالعہ وسیع ہے اُن کا دماغ بہ ادنیٰ تامل ایسے اشعار پیش کر سکتا ہے کہ مافی الضمیر کو اس حُسن سے اس صناعت سے چھپانے کی بہ ظاہر کوشش کی گئی ہے کہ وہ برافگندگیٔ نقاب سے کہیں بڑھ کر بے نقاب ہو گیا ہے۔ آپ نے عورتوں کو سینہ پہ آنچل دُہراتے ہوئے دیکھا ہے؟ فرمایئے اس سے مقصود سترِ عورت ہوتا ہے یا نمائشِ شباب؟ بہ ظاہر ڈھلکے ہوئے اور در حقیقت ڈھلکائے ہوئے آنچل کو رہ رہ کر دُہرانے کی ادا کو آپ شاعری نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، اصل بحث پر آیئے۔ کلامِ فانی پر نظر کرنے سے پیشتر طریقۂ عام کی طرح میں بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ابتدائے کلام میں ہی یہ بات ظاہر کر دوں کہ میں شعر کو کس عنوان پہ سمجھا ہوں اور میرے نزدیک معیارِ شعر کیا ہے؟ میری تعلیم و تربیت اور مذاقِ ادب نے مجھے یہ سمجھایا ہے کہ ہم جب یہ چاہتے ہیں کہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کریں تو اس کے لئے حرکات و سکنات سے قطع نظر وسیلۂ کلام اختیار کرتے ہیں۔ الفاظ وسیلۂ کلام ہیں اور ہمارا وہ خیال جس کو ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں سببِ کلام۔ اگر ہم نے اپنے ملکۂ کلام سے اس اپنے مقصد کو حاصل کر لیا یعنی ایک یا زائد الفاظ سے اپنا مقصد ظاہر کر دیا تو کلام کی شرطِ اول پوری ہو گئی۔ مگر وہ شعر نہ ہوگا۔ کلامِ محض اور شعر میں فرق ہے

اگر ہم نے اپنے کسی خیال کو کسی ایسے مجموعۂ الفاظ میں ادا کیا کہ جو ہماری زبان سے نکلتے وقت کرۂ ہوا میں کچھ ایسی لہریں پیدا کر گئے جن کے باہم ایک گونہ توازن ہو تو وہ کلام موزوں ہوگا شعر وہ بھی نہ ہوگا۔ اگر وہ خیال جو ہم نے ظاہر کیا ہے اُس میں کوئی ندرت یا نزاکت ہے تب بھی محض نازک یا نادر خیال کی ادائی سے کلام کلام ہی رہے گا شعر نہ بن جائے گا۔ غرضکہ نہ محض کلام موزوں شعر نہ نازک یا نادر خیال کا اظہار شعر اور نہ ان دونوں کا مجموعہ شعر یعنی اگر کوئی نازک یا نادر خیال ایسے مجموعۂ الفاظ میں ظاہر کیا جائے جو اپنے اندر کسی قسم کی موزونیت جس کو دوسرے الفاظ میں موسیقیت بھی کہہ سکتے ہیں رکھتا ہو تب بھی وہ شعر نہ ہوگا شعر کے لئے ایک تیسری شرط بھی لازم ہے اور وہ ہے خیال اور الفاظ کے ساتھ قوت محرکہ کا امتزاج۔ وہ قوت جو قلب میں کسی خیال کی محرک ہوتی ہے جو طبیعت کو اُس خیال کی ادائی پر مجبور یا آمادہ کرتی ہے یعنی جذبہ وہ ہے بمنزلہ روح کے، خیال یعنی مجرد مادہ جب الفاظ کا جسم اختیار کرے تو وہ جسم خواہ وہ کتنا ہی خوش نما کیوں نہ ہو محض ایک بے جان لاش ہوگی جب تک کہ اُس میں یہ روح موجود نہ ہو اس روح کے اُس جسم میں داخل ہو جانے سے اُس میں فاعلیت یعنی اثر پیدا ہو جائے گا۔ قائل کا خیال الفاظ کا جسم اختیار کر کے جب جذبہ کی روح کا حامل ہوگا تو وہ مخاطب کے دماغ تک نہ صرف اپنے مفہوم و معنی کو منتقل کریگا بلکہ سامع کے دماغ میں ایسا اہتزاز پیدا کر دے گا جو بالکل متوازی ہوگا اُس

تحریک کے جو قائل کے اندر اظہار و انتقال ذہنی کی محرک ہوئی اور یہ کیفیت مثبتہ ہوگی یعنی اس کا اثر انبساطی ہوگا۔ اس تشریح سے آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ شعر کی تعریف یہ قرار پائیں کہ قائل کا خیال ایسے الفاظ کا جسم اختیار کرے جو اُس کے مفہوم کے حامل ہوں، اور قائل کا وہ جذبہ جو اس خیال کا محرک اصلی تھا اُس میں موجود ہو اور جب یہ خیال ان مخصوص الفاظ کے ذریعہ سے سامع کے دماغ تک پہنچے تو اُس میں کیفیت انبساطی پیدا کردے میرے خیال میں بغیر ان تمام شرائط کی موجودگی کے کوئی کلام شعر نہیں ہوتا ہم ایسے کلام کو جو ان تمام شرائط کو پورا نہ کرتا ہو، کلام موزوں، کلام نظم، جو چاہیں کہہ سکتے ہیں مگر وہ شعر نہیں کہا جاسکتا۔ بخلاف اس کے جو کلام ان تمام شرائط کو پورا کرتا ہے وہ شعر محض ہے۔ پھر اگر ان شرائط کے پورا کرنے میں کوئی خاص اہتمام برتا گیا ہے یا اُس کے اجزائے ترکیبی میں کسی خاص حکمت و صناعت کا دخل ہے جس سے اُس کے داخلی اور خارجی کوائف میں توازن یا تناسب پیدا ہوگیا ہے تو اُسی لحاظ سے وہ کلام بجائے شعر محض کے پسندیدہ، عمدہ، بلند، پُر اثر، قابل کہلائے گا۔ یہاں یہ واضح کردینا بیجا نہ ہوگا کہ شعر کا درجہ یا معیار قائم کرنے میں جدا جدا قوتیں یا تحریکیں کام کرتی ہیں۔ جہاں تک کہ اس بحث کا تعلق ہے کہ خیال جو ظاہر کیا گیا ہے وہ کس درجہ کا ہے الفاظ جو ادائے مطلب کے لئے استعمال کئے گئے وہ کہاں تک اُس خیال سے مناسبت یا اس کے

انتقال کی اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں، اور یہ کہ اُن کی ترتیب کس نوع کی ہے اور اُس سے انتقال ذہنی میں کس حد تک مدد ملتی ہے اور یہ کہ ان الفاظ اور اُن کی مخصوص ترکیب سے اصل خیال کی محرک قوت یعنی قائل کا جذبہ یا بالفاظ دیگر روح شعر کس شدت یا توانائی کے ساتھ اُس میں منتقل ہوئی یا کارفرما ہے یہ تمام باتیں ایک ادیب یا ناقد اپنے مقررہ اصول و قواعد کے تحت معین کر سکتا ہے، اور کرتا ہے اور یہ کہ اس شعر نے سامع کے دماغ پر کیا اثر کیا۔ قائل کا خیال اُس کے قوتِ محرکہ یعنی جذبہ کے ساتھ کس حد تک موثر ہوا۔ اور سامع کے دماغ پر اس کا اثر مثبت ہوا یا منفی یعنی اُس نے کیفیت انبساط پیدا کی یا انقباض اور وہ کس درجہ کی، یہ امر چونکہ محض ذوق سے متعلق ہے اور سامع کی وقتی کیفیات اور حالات اس میں ممد و معاون یا اُس کی مخل و مخالف ہوتی ہیں اس لئے اس کا تصفیہ کسی خاص نہج پر یعنی مقررہ قواعد و ضوابط کے تحت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ امر محض ناقد کے ذوق سے متعلق ہے اور اُس پر ہر وقت بحث ہو سکتی ہے اور حقیقتاً اس پر بحث ہے بھی عبث۔

متذکرہ صدر الفاظ میں شعر کے اجزائے ترکیبی یا لوازم بنیادی بیان ہوئے۔ اسی سلسلہ میں یہ چند اشارات بھی اس بیان کو زیادہ قابل فہم اور واضح کرنے میں غالباً ممد ہوں گے کہ انتقال ذہنی کے لئے خیال کو چھپاتے ہوئے

محض اُس قدر بیان کرنا یا اُس کی طرف صرف اتنا اشارہ کرنا جس کے بغیر وہ منتقل ہی نہ ہو سکے اور اس غرض کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جائیں وہ اور پیرایۂ بیان ایسا اختیار کرنا جو اُس مطلب کی طرف محض اشارہ کرے، یا بالفاظ دیگر سامع کی دماغی بصیرت کو دور سے اُس خیال کی جھلک دکھا دینا شعر کو واقعی شعر یعنی نہایت بلند اور قاتل بنا دیتا ہے۔ لارڈ مارس نے دو الفاظ Cruel Reticence میں اس خیال کا اظہار کیا ہے یعنی جب ہم کسی کلام کو سن کر قائل کے مطلب کو تو پا جائیں مگر کلام کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت اور جرح و قدح سے یہ ثابت ہو کہ جو بات کہنا چاہی ہے وہ بجائے کہنے کے چھپائی گئی ہے۔ اس اندازِ بیان کو یا اس صنعت کو Reticence کہتے ہیں اور یہ جس حد تک بھی برتا جا سکے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں کہ اس کا برتنا ہر شخص کیا ہر شاعر کا بھی کام نہیں۔ اردو شاعری میں یہ چیز مومنؔ اور غالبؔ کے علاوہ دوسری جگہ بہت کم نظر آتی ہے۔ فانیؔ کے کلام میں اس کی بہت مثالیں نظر آتی ہیں۔

شعر کی صحیح تعریف یا صحیح شعر کی تعریف کے سلسلہ میں ایک بات اور عرض کر دوں۔ اصطلاح کیمیا میں جب دو یا زائد اشیا کو باہم آمیز کیا جاتا ہے تو ایک چیز بنتی ہے (مجموعہ Mixture) اور دوسری ایک چیز مختلف ترکیب سے تیار ہوتی ہے Compound (یعنی مرکب) مجموعہ میں ہر شے اپنے اپنے

وجود کو اپنی صفت یا کیفیت کے ذریعہ سے ظاہر کرتی رہتی ہے۔ اور مرکب میں تمام اشیا باہم مل کر ایک نئی چیز یا جدا خاصیت پیدا کر دیتی ہیں جو فرداً فرداً "اُن اجزائے ترکیبی میں کہیں نظر نہیں آتی اسی طرح شعر وہ ہے جس میں الفاظ کے معنی، اور الفاظ کی ترکیب سے پیدا شدہ معنی کے علاوہ اُن کی مخصوص ترتیب سے ایک تیسرے مفہوم کا قرینہ پیدا ہو جائے جو کلام کے کسی لفظ یا جملہ کے معنی سے پیدا نہ ہوتا ہو۔ مگر پر وازِ کلام بحیثیت مجموعی وہ معنی پیدا کر رہا ہو۔ اس تشریح سے ظاہر ہو گا کہ اگر شعر کی ترکیب نے کیمیاوی اصطلاح میں اُس کو کمپاؤنڈ (مرکب) بنا دیا ہے تو وہ حقیقتاً بلند شعر ہو گا اور اسی نسبت سے وہ سامع کے دماغ پر اثر انداز بھی ہو گا۔

مذکورہ بالا تشریحات و توضیحات کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ شعر کے متعلق میں نے اپنا نظریہ واضح طریق پر پیش کر دیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اربابِ علم و ادب اُس کو بڑی حد تک قابلِ قبول پائیں گے۔

شعر کی حدود اس درجہ متعین کر دینے کے بعد میں اس موقع پر مناسب خیال کرتا ہوں کہ شعر کی خوبی اور شعر کا معیار جانچنے کے لئے ایک پیمانہ اور عرض کر دوں۔

آپ بہتر سے بہتر شعر کو دیکھیں گے تو اس میں تین محاسن نظر آئیں گے حسنِ خیال[1]، حسنِ بیان[2]، اور حسنِ زبان[3]، بہ الفاظِ دیگر یہ تین محاسن شعر کی خوبی

کا معیار ہیں جہاں یہ تینوں محاسن موجود ہوں آپ اُس شعر کو بہترین شعروں میں سے پائیں گے۔ ممکن ہے بعض اشعار میں دو ہی محاسن موجود ہوں اور بعض میں صرف ایک ہی مگر جہاں ایک بھی نہ ہو تو یقیناً وہ شعر نہ ہو گا۔ آپ اس کو کوئی دوسرا نام دے سکتے ہیں۔

ایک شاعر کے کلام پر نقد کے سلسلہ میں علمی اور فنی مباحث پر زیادہ تفصیلی گفتگو یقیناً ناخوش آئند ہوتی ہے اور مجھے خوف ہے کہ اس خاص مبحث پر میرے بیان میں کچھ طوالت پیدا ہو گئی ہے مگر فانیؔ کے کلام کو سمجھنے کے لئے اُس کی طبیعت اور فطرت کا سمجھنا جس قدر لازمی تھا اُسی قدر اُس کے کلام کے محاسن اور اُس کی صناعت کو جانچنے اور اُس سے لطف اندوز ہونے کے لئے شعر اور خصوصیات شعری کیا ہیں یہ مفہوم بھی دماغ میں واضح اور متعین ہونا ضروری تھا۔

فانیؔ نے اپنے اظہار خیال کے لئے صنف غزل کو منتخب کیا یہ کوئی اضطراری عمل نہ تھا۔ بلکہ ایک غم رسیدہ، بیزار، بیدل، اور بے کیف شخص سے جو اس مادی دُنیا کی چلتی پھرتی لاشوں یا اس سماج کے انسان نما جانوروں سے بات کرنے سے گھبراتا ہو، جو اپنے دل کا حال اپنی آنکھوں سے چھپاتا ہو وقت گفتگو مختصر جملوں کے سوا آپ کیا امید رکھ سکتے ہیں؟

فانیؔ کا اپنے دردِ دل کے اظہار کے لئے صنف غزل کو اختیار کرنا بالکل فطری عمل تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اُن کا یہ فعل اتنی ہی بڑی غلطی ہوتا جیسی کہ

ڈاکٹر اقبال کی اکبر کے رنگ میں کہنے کی کوشش۔

مجنوں گورکھپوری نے فانی کے متعلق (نگار جنوری ۱۹۵۰ء) نہایت جچی تُلی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ اور میں بیشتر مقامات پر اُن کا ہم خیال ہوں۔ انہوں نے جو بات کہی ہے اُس کی وہ ایک دلیل رکھتے ہیں۔ اور جہاں اُن کو دلیل نہیں ملتی وہاں بھی وہ اپنی قابلیت سے ایسی توجیہ پیش کرتے ہیں کہ بلوی النظر میں وہ خواہ مخواہ قابل قبول نظر آنے لگتی ہے۔

انہوں نے بالکل صحیح فرمایا کہ "شاعر اپنی تمام انفرادیت اور انتہائی نرالی شخصیت کے باوجود اپنی نجی زندگی کے خارجی اسباب و حالات سے اور اپنے عہد کے اجتماعی اور معاشری میلانات و محرکات سے بے تعلق اور بالاتر نہیں ہوتا"

فانی کا کلام اس کی زندہ مثال ہے اُن کا کلام اُن کی نجی زندگی کے خارجی اسباب و حالات کی سر بسر تفسیر ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اپنے عہد کے اجتماعی اور معاشری میلانات سے متاثر ہوئے۔

بدایوں کی شاعری اور بدایوں کی زبان پر ہر عہد اور ہر دور میں دہلی کے مقابلہ میں لکھنؤ کا بہت زیادہ اثر رہا ہے۔ چنانچہ وہ فانی کے یہاں بھی نہ صرف موجود ہے بلکہ نمایاں ہے۔

فانی کے ابتدائے زمانۂ شاعری میں داغ اردو شاعری کی دنیا پر چھایا ہوا تھا، شعر و ادب کے جلسوں میں، اسکولوں اور کالجوں میں، مدرسوں اور خانقاہو

میں، طوائفوں اور قوالوں میں، غرضکہ پست سے پست اور بلند سے بلند صحبت میں داغ کا سکہ چل رہا تھا۔ حالی پانی پت میں، یزداں (بیان) میرٹھ میں، امیر و جلال وغیرہم لکھنؤ میں، اکبر الہ آباد میں، اور شاد عظیم آباد میں موجود تھے مگر ان سب کے سر پر ایک آسمان تھا اور اس کا نام داغ تھا۔ فانی اپنے تمام غم والم، اپنی تمام انفرادیت کے باوجود اس کی زد سے نہ بچ سکے۔

غالب اور میر تو اردو شاعری کی رہتی دنیا تک جینے والی ہستیاں ہیں ان کا اثر فانی کے یہاں اس قدر نمایاں ہے کہ جن کی نگاہیں نکتہ رس نہیں ہیں وہ فانی کو غالب و میر کا مقلد سمجھتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فانی کا کلام ایک عطر ہے جس کی زمین یا نہ غالب اور میر کے کلام سے دی گئی ہے اور اس کا ایک خاص سبب بھی ہے۔ میر کے دل کا درد اور غالب کے دماغ کی حکیمانہ اور فلسفیانہ طرز فکر، فانی کو کچھ قدرت نے ودیعت کئے تھے، کچھ زمانے نے تکمیل کی۔ اس طرح وہ چیز جو میر اور غالب میں بٹی ہوئی تھی، فانی کے یہاں آکر جمع ہو گئی جو فرق نظر آتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ میر اور غالب پر صدمات اتنے شدید نہ پڑے تھے اس لئے میر اور غالب کے بیان میں ایک وسعت ہے اور فانی شدت غم کی وجہ سے بیان اور فکر میں محدود سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ صحیح مان لینے کے بعد بھی کہ فانی کے یہاں نشاط غم نہیں ملتا جو میر کا خاص اکتساب ہے اس کو فانی کا نقص سمجھنا سخت غلطی ہے۔ میں اس بارہ میں مجنوں گورکھپوری کے

اس بیان سے متفق نہیں ہوں کہ "فانیؔ ایک صالح اور ہونہار شخصیت کے مالک تھے، مگر تذبذب، انتشار، اور بے اطمینانی کی دنیا نے اس شخصیت کو مسخ کر دیا اور اُن کے محسوسات وافکار نے سقیم صورت اختیار کی۔" اس بات کو انہوں نے مغرب کے چند مرعوب کن ناموں کے ساتھ فانیؔ کو منسلک کر کے ایسے فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے جیسے یہ کوئی امر واقعہ ہو۔ مجھے پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دنیا کتنی خود غرض ہو گئی ہے۔ ایک شخص کے چوٹ لگی ہوئی ہے، خون بہہ رہا ہے، وہ مجبور ہے کہ تڑپے، روئے، کراہے، اور آپ اُس کے پاس کھڑے ہو کر اُس کے زخم کو دیکھتے ہیں، اُس کی کراہ کو سنتے ہیں، اُس پر غور اور تامل فرماتے ہیں اور یہ کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں کہ اس شخص کی یہ کیفیت "توانا دل و دماغ کی علامت نہیں اور نہ یہ صورت اجتماعی زندگی کے حق میں صحت بخش ثابت ہو سکتی ہے۔" سبحان اللہ۔ کیسے توانا دل و دماغ کی صحیح فکر کا نتیجہ یہ اظہار خیال ہے۔ کون کہتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے لئے صحت بخش علامتیں ڈھونڈھنے والے جوشؔ کے لائحہ عمل میں شریک نہ رہ کر فانیؔ کی غزل، ہاؤس مین کی نظم، ہارڈی کے ناول اور شوپنہار کے فلسفہ میں وقت ضائع فرمائیں۔ شاید یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس تماشہ گاہ عالم میں اس عرصۂ دُنیا پر ہر شخص ایک کامیاب ہیرو ہی کا پارٹ ادا کرے۔ یا پھر یہ خلاف وضع فطری عمل اختیار کیا جائے جو ہماری سینما کی دُنیا میں نظر آ رہا ہے کہ آپس میں لڑائی ہوتی ہے تو تال سُر سے اور کوئی مر کر گرتا ہے تو طبلہ

کی چھاپ ہر بچہ سے لیکر بوڑھے تک اور فقیر سے لیکر بادشاہ تک اور جشن ہائے عیش سے لیکر صف ماتم تک ہر جگہ ہر حالت میں ہر شخص گاتا ہوا ہی نظر آتا ہے۔

ایسے نظر باز سے کون کہے کہ

غم کی حقیقتیں سمجھ غم کہ ہے اصل کائنات عیش و نشاط سے گزر کھیل ہے یہ مجاز کا

آپ لطشتے کے حوالے سے مرعوب ہوں تو سُنئے وہ کہتا ہے

All progress is in the spiritualization of pain

میں پھر عرض کروں گا کہ دنیا کا مدار اسی پر ہے کہ ہر شخص اپنا فریضہ ادا کرے۔ اور یہی عمل قرین فطرت ہے جو اپنے ماحول سے مناسبت کلی رکھتا ہو۔ ایک ڈرامہ کی کامیابی یہی ہے کہ اس کے ایکٹر اسٹیج پہ پہنچ کر اپنا اپنا پارٹ ڈائرکٹر کی ہدایت اور ڈرامسٹ کی مرضی کے مطابق ادا کریں۔ ایک شاعر کا وہی کلام اُس کے دماغ کی صحیح پیداوار سمجھا جائے گا جس میں شاعر کی فطرت اس کا مذاق طبیعت، اُس کا مزاج اصلی اور اس کا حقیقی کردار بدرجہ اتم سمویا ہوا ہو۔ اور جو شاعر شعر کہتے وقت اپنی فطرت، اپنے جذبات دل اور اپنے داعیات قلب کو نظر انداز کرکے اجتماعی زندگی کے حق میں صحت بخش مواد پیش کرکے توانا دل و دماغ رکھنے کی سند حاصل کرنا چاہتا ہے وہ حقیقتاً اپنا مظہر فنا خود تیار کرتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ذوق نے ضروریات وقت اور تقاضائے زمانہ کو پیش نظر رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا آج دیکھئے اُن کے کلام کا کتنا حصہ زندہ

ہے اور غالب نے اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضہ کو مدِ نظر رکھا، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مر گیا۔

شعر کی روح شاعر کا جذبہ ہے اور جذبہ اُس وقت کلام میں منتقل ہوتا ہے جب وہ ہر خارجی اثر سے بے نیاز ہو کر قلب شاعر سے پھوٹ نکلے۔ اس لحاظ سے بے خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فانی کا کلام چونکہ اُن کے دکھے ہوئے دل کی کراہ ہے اور اس میں روحِ شعر موجود ہے اس لئے وہ زندہ رہنے والی چیز ہے۔

ایک موقع پر پروفیسر صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ "فانی کا کلام اپنے گھیر کی تنگی اور کم پہنائی کے باوجود ہم کو شروع سے آخر تک اکتانے نہیں دیتا۔" اس کا سبب پروفیسر صاحب نے نہیں ظاہر فرمایا۔

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ جب شعر کے الفاظ اور بیان اپنے ساتھ شاعر کا جذبہ یعنی شعر کی روح لیکر نکلتے ہیں تو وہ سامع کے دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اُن میں اظہار خواہ شدید غم والم کا کیوں نہ ہو۔ شاعر کے نقش کمال سے سامع کے دماغ پر کیفیت انبساطی طاری ہو جاتی ہے۔ فانی کے کلام سے تھکن اور ناگواری کی کیفیت اسی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی کہ اُن کے اشعار سے انقباض پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہی دلیل ہے اس دعوے کی کہ فانی کے کلام میں اشعار کی کثرت ہے اور محض کلام منظوم بہت شاذ۔

ایک بات جس پر فانی کے نقادوں میں سے شاید کسی نے گفتگو نہیں کی وہ یہ ہے

کہ شاعر کے وہ اشعار جو عام طور پر پسند کئے جاتے ہیں لازمی نہیں کہ خود شاعر کو بھی وہ خاص طور پر اتنے ہی پسند ہوں اور وہ اشعار جن کو شاعر خود زیادہ پسند کرتا ہے ضروری نہیں کہ سننے والے بھی اُن کو اُسی درجہ پسند کریں۔ (مشاعرہ کی داد کا اس بحث سے مطلق کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے کہ ایسے ہنگاموں کی داد بیداد سے بدتر ہے) اس کا اصلی سبب صرف یہی نہیں کہ مذاق جداگانہ ہوتے ہیں اور چونکہ خود شاعر بھی ایک مذاق رکھتا ہے اس لئے جس طرح دوسرے اُس کے کلام کے متعلق اچھی بُری رائے رکھتے ہیں وہ بھی اپنے شعروں کے متعلق اچھے اور بہت اچھے ہونے کی ایک رائے رکھتا ہو۔ بلکہ اس اختلاف کا حقیقی سبب اس راز میں پوشیدہ ہے کہ شاعر جانتا ہے کہ اُس کے شعر کا محرک کونسا جذبہ تھا اور اُس شعر کا خیال آتے ہی اُس پر تحریک اول کی کیفیت جس کے تحت اُس نے وہ خیال پیش کیا تھا طاری ہو جاتی ہے اور وہ بجائے محض شعر سے لطف اندوز ہونے کے اپنی اُس داخلی کیفیت کا معمول بن جاتا ہے۔ دوسرے لوگ اس تاثر سے مامون ہوتے ہیں اس لئے اُن کی پسند اور ناپسند کا انحصار ہوتا ہے محض شعر کی داخلی کیفیات پر اور خود اُن کی (سننے والوں کی) اُس وقت کی کیفیت دماغی پر۔

اس کے علاوہ شاعر جو نہایت حسّاس دماغ رکھتا ہے بعض خارجی کیفیات اور اپنے ماحول سے وقتی طور پر متاثر ہو کر اظہار خیال پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس

اظہارِ خیال میں چونکہ روحِ شعری موجود رہتی ہے اس لئے وہ سامع کے دماغ پر متاثر ہوتی ہے مگر چونکہ وہ شاعر کی داخلی کیفیت کا نتیجہ نہیں اس لئے شاعر کی فطرت سے وہ غیر متعلق سی بات ہوتی ہے اس لئے اُس کو اُس خاص پیدا وار دماغی میں کوئی انہماک نہیں ہوتا۔ یہ سبب ہوتا ہے کہ ایک چیز کو سننے والے بیحد پسند کرتے ہیں مگر شاعر پر وہی چیز کوئی خاص کیفیت طاری نہیں کرتی۔

یہاں پر یہ بیان یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا حضرت مجنوںؔ گورکھپوری فانیؔ سے اپنے غائبانہ تعارف کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اُن کی شہرت فروغ پا رہی تھی۔ سب سے پہلے جن اشعار نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہی تھے جو ان دنوں اردو بولنے اور سمجھنے والی دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونج رہے تھے جس تعلیم یافتہ نوجوان کے کمرہ میں پہنچ جاتے ایک پُرسوز لحن کے ساتھ گنگنانے کی آواز آرہی تھی۔

تا آلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

اور جس بکہ بان کو دیکھئے تانیں لیتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

چلے بھی آؤ یہ ہے قبرِ فانی دیکھتے جاؤ تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

مطلع سے لیکر مقطع تک پوری غزل ایک دُھن میں ہے جس کو میں امرِ عشق کی دُھن کہوں گا۔ کون ہے جو یہ اشعار پڑھے یا سُنے اور بے اختیار اپنے دل میں ایک کسک اور اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک نہ پائے۔ اس غزل

میں جو گہرائی فضا ہے اور اس کے ہر شعر میں بین کا جو انداز ہے اس سے میرا مزاج رکھنے والے لوگوں کو کبھی کوئی مؤانست نہیں ہو سکتی لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں بھی ان اشعار کو پڑھ کر ایک اداسی محسوس کئے ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لئے کہ پوری غزل کی تاثیر میں ایک قسم کی ناگزیریت ہے۔ وہی ناگزیریت جو "زہر عشق" کے وصیت نامہ میں ہے۔"

دیکھا آپ نے ایک ناقد کا بیان جو بلاشبہ ایک امر واقعہ ہے مگر عام طور پر کسی کو کیا معلوم کہ خود فانی کی رائے اپنی اس غزل کے متعلق کیا تھی سنئے میں بتاتا ہوں۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس غزل کا ذکر آگیا کہنے لگے "مجھے اس کے ذکر سے شرم آتی ہے۔ جب کوئی میرے سامنے اس غزل کا شعر پڑھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے گالی دے رہا ہو۔ جی چاہتا ہے اس جگہ سے اٹھ کر چلا جاؤں" موجودین میں سے ایک صاحب نے فرمایا کہ "پسند عام سے نفرت آپ کی خصوصیت ہے" میں نے کہا کہ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے محرک چونکہ شدید تھا اسلئے لکھتے وقت احساس نہ ہوا۔ اس غزل کی ردیف نے ایک التجا، ایک سوال، ایک خواہش کی صورت پیدا کر دی ہے جو شاعر کی غیور اور خوددار طبیعت کے منافی ہے اس لئے آپ کی طبیعت اس کی تکرار سے گھبراتی ہے۔ چونکہ اس اظہار حقیقت میں ایک پہلو تعریض کا تھا اس لئے دونوں جانب سے اس نکتہ پر زیادہ گفتگو نہ ہوئی۔

فانی کے ناقدوں نے اُن کے کلام کو اُن کے پیشرو اور بعض ہم عصر شعرا
کے کلام کے مقابل رکھ کر تبصرہ فرمایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض ادیبوں
نے صحیح معنی میں دادِ سخن دی ہے اور نہایت دیانتداری سے فرضِ نقد ادا
فرمایا ہے۔ بعض نے اس کا صرف دوسرا ہی رُخ دیکھا (سید حامد صاحب ایم اے
فانی نمبر علیگڈھ میگزین) مجھے اس سلسلہ میں اسی قدر عرض کرنا ہے کہ فانی لکھے پڑھے
شخص تھے، اردو اور فارسی میں زبان و ادب، شعر و شاعری پر جو معروف مباحث
تھے اُن کی نظر میں تھے۔ اس دور کے بیشتر مشہور و معروف شعرا کی طرح فنِ
شعر سے نابلد نہ تھے۔ اُن میں یہ انانیت نہ تھی کہ جہاں فنِ عروض کے مقررہ
قواعد کی پابندی نہ ہو سکے وہاں اپنی کمزوری اور غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے
یہ نوٹ لگا دیں کہ میں اس کو جائز سمجھتا ہوں۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ سرقہ
کسے کہتے ہیں اور توارد کیا ہے۔ اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی مشہور شاعر
کے معروف کلام کو اس طرح اپنے انداز میں کہنا کہ اُس میں کوئی اضافہ ہو جائے
کوئی حسن، کسی قسم کی معنویت بڑھ جائے تو اُس کو ترقی کہتے ہیں اور اگر یہ
کچھ نہ ہو۔ خیال، بیان، یا زبان محض الفاظ، بحر یا ردیف قافیہ بدل کر لکھ دیئے
جائیں تو وہ سرقہ ہو جائے گا۔ اس وقت خیال آگیا، بات غیر متعلق نہیں اہلِ
ذوق کے لطف کے لئے لکھے دیتا ہوں، میر درد کا ایک شعر ہے ؎

میرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ　　یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

میر تقی نے لکھا ہے

مری تغیر رنگ پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

اُستاد مومن خاں صاحب فرماتے ہیں

مری تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھے اپنی نظر نہ ہو جائے

کون کہہ سکتا ہے ایک کے سامنے دوسرے کا شعر نہ تھا۔ وہی خیال قریب قریب اُنہیں الفاظ میں لکھا گیا۔ اور اہل فن، زبان داں اور سخن فہم حضرات نے اس کو بالکل جائز سمجھا اور تسلیم کیا پہلے شعر پر بعد میں ترقی ہو گئی ہے۔ بالفرض کوئی ترقی نہ ہو مگر الفاظ کی تبدیلی مختلف شاعروں کے مخصوص رنگ کو ظاہر کر دے تب بھی وہ سرقہ نہ ہوگا۔

ایک مثال لطف سے خالی نہ ہوگی۔ دربار رامپور میں تین مشاہیر فن جمع ہیں۔ ایک مصرعہ تینوں کے زیر غور لایا جاتا ہے تینوں دوسرا مصرعہ بہم پہنچاتے ہیں۔ تینوں کا خیال بالکل ایک ہی جگہ پہنچا ہے۔ مصرعہ کا مصرعہ سوائے ایک لفظ کے تبدل و تغیر کے تینوں کے یہاں ایک ہے مگر دیکھئے ایک لفظ کی تبدیلی کیسا حیرت ناک اظہار تین مختلف رنگوں کا کرتی ہے۔ مصرعہ تھا ع ہم نے مانا کہ قیامت ہوگی۔

اُستاد امیر مینائی مرحوم فرماتے ہیں ع کس کے قامت کے بدولت ہوگی

حضرت داغ کا مصرعہ ہے ع کس کے قدموں کی بدولت ہوگی۔

اور جان صاحب ایک لفظ سے ریختی بنا دیتے ہیں ع کس اکے فعلوں کی بدولت ہوگی

یہ ہے توارد۔

آپ نے ابن یمین کا کلام ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ یہ حافظ شیرازی کے پیشرو ہیں۔ دونوں کے یہاں غزلیں کی غزلیں بقید بحر و ردیف و قافیہ ملتی ہیں مگر کسی اہل فن یا سخن فہم نے آج تک یہ کہنے کی حماقت نہ کی کہ حافظ نے ابن یمین سے سرقہ کیا۔ ظاہر ہے کہ ترقی و اصلاح نے سرقہ کے الزام کا امکان ہی باقی نہ رکھا۔

روبہ مطلب فانی کے یہاں بیشتر مضامین ایسے نظر آتے ہیں جو ان کے پیشرو فارسی اور اردو کے معروف شعراء کے یہاں متداول ہیں۔ کس قدر یکطرفہ عذر ہوگا اگر کہا جائے کہ ان اساتذہ کا کلام فانی کے پیش نظر نہ تھا۔ مگر میں علی الرغم یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ فانی کی طبیعت، فطرت، اور اس کا کمال و مرتبہ اس سے بدرجہا بلند تھا کہ کسی کے کلام سے سرقہ کا وہم و گمان بھی اس کے دماغ میں گزرے۔ جہاں اس نے ایسے مضامین نظم کئے ہیں وہ مواقع اس کے کلام میں خاص غور اور توجہ چاہتے ہیں۔ بے لوث مطالعہ ثابت کردے گا کہ اس نے سابقہ خیال، بیان، زبان میں کسی نہ کسی انداز سے کچھ ترقی ہی کی ہے۔ اگر آپ کا تامل و تدبر آپ کو اس فیصلہ پر نہ پہنچا سکے تو کسی ایسے بزرگ سے رجوع کیجئے جس کی سخن فہمی پر آپ کو اعتماد و اعتبار ہو ورنہ مرحومین پر فاتحہ پڑھئے اور سمجھ لیجئے کہ دونوں میں سے ایک سے آپ کو اور آپ کی طبیعت کو خاص شغف ہے اور بس۔

ممکن ہے بعض حضرات کو یہ اظہار خیال ناگوار گزرے مگر بہ سلسلۂ نقد میں یہ

کہنے پر مجبور ہوں کہ فانی کے کلام کو اُس کے ہمعصر شعرا کے مقابلہ میں لانا بڑا ظلم ہے۔ فانی محض غزل کا شاعر تھا اور اس صنف میں سوائے حسرت کے کوئی دوسرا اُس مرتبہ کو نہیں پہنچا اور سوائے حسرت کے ہر شخص اُس درجہ میں ہے جہاں سے وہ فانی سے اکتساب یا قبول اثر کر سکتا ہے۔ فانی کہیں اتنا پست نہیں کہ ہم یہ وہم و گمان بھی کر سکیں کہ اُس نے عزیز و غیرہم کا کوئی اثر کسی نوبت پر قبول کیا۔

اب ایک ہی بات اور کہنا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صاحب نے گویا فانی کو نظر بد سے بچانے کے لیے فانی کے کلام میں خامیوں کا ذکر بڑے حسن و خوبی سے فرمایا ہے کہ "بعض اشعار میں دونوں مصرعے متوازن نہیں"۔ ایک دوست کی نظر سے ایک ظانئی حسن و خوبی نظر سے اسی کی توقع کیجا سکتی تھی۔ بخلاف اس کے نظیبہائے مضامین (علیگڈھ میگزین فانی نمبر) کے سلسلہ میں حضرت سیماب نے فانی کے اشعار پر جس انداز سے نظر فرمائی ہے وہ بالکل اُن کی فطرت کے مطابق ہے علامہ موصوف کے اجتہاد پر محاکمہ کا یہ موقع نہیں محض اس خیال سے کہ فانی کا مطالعہ کرنیوالوں میں سے کوئی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے اس قدر عرض کر دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ حضرت سیماب کی رائے حرف آخر نہیں ہے اور نہ اُن کا فیصلہ ناطق۔ اُن کے عائد کردہ چند اعتراضات پر سرسری نظر کرتے چلیے:۔

(۱) جز دعدۂ باطل نہیں بنیاد کچھ اسکی — دل کانپ گیا دیکھ کے ایوان تمنا

(۲) نزریت کا حاصل بنا یا دل جو گویا کچھ نہ تھا — غم نے دل کو دل بنایا ورنہ کیا تھا کچھ نہ تھا

ان شعروں پر حضرت نے جو تنقید فرمائی ہے اُس سے صریحاً یہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت نے شعروں کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں فرمائی۔ ورنہ یہ اعتراض ہرگز عائد نہ فرماتے۔

(۳) سوزِ برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے   ورنہ پہلے سوزِ غم ایک شعلۂ بیہوش تھا

حضرت فرماتے ہیں "شعلۂ بیہوش معناً غلط ہے"۔ اصلاح ہوتی ہے "شعلۂ خاموش ہونا چاہئے"۔ کاش اس پر کچھ تامل فرماتے کہ وجودِ شعلہ کی دو حدیں ہیں۔ ایک ابتدا۔ ایک انتہا۔ شعلۂ خاموش حدِ انتہائی کے بعد کی کیفیت ہے۔ اور اگر مقصود ابتدائے کیفیت کا بیان ہو تو کیا اس ترکیب سے وہ بہتر بیان نہیں ہوتی۔ مگر یہ بات تو مفہوم شعر ذہن میں موجود ہونے کے بعد پیدا ہوتی۔

(۴) پوچھتے ہو نشانِ فانی کیا   وہ ہے اک قبرِ بے نشان انجام

ارشاد ہوتا ہے انجام زوائد سے ہے۔ بے نشاں پر شعر کا مفہوم ختم ہو جاتا ہے" کیونکر عرض کروں چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی حضرت ایسی نازک ترکیب سمجھنے کے لئے تھوڑے سے تامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ انجام زوائد سے ہے نہ نشان پر شعر کا مفہوم ختم ہوتا ہے۔ وہ ہے کا اشارہ ثابت کرتا ہے کہ نشان موجود ہے خواہ کسی حالت میں کیوں نہ ہو ایک لفظ انجام سے اُس کی آئندہ ہونیوالی حالت کی تصویر کھینچ دی ہے اور پہلے مصرعہ کے لفظ فانی کی معنویت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ آپ اس شعر کو محض مقطع نہ سمجھیں۔ فانی تخلص بھی ہے اور معنوی معنی بھی دے رہا ہے۔ نشانِ فانی کے مقابلہ کا ٹکڑا بے نشان انجام ہی ہو سکتا ہے۔ ان نزاکتوں پر اکثر نظر نہیں

جاتی۔ زیادہ کیا عرض کروں۔

(۵) گم کردہ راہ ہوں قدم اولیں کے بعد   پھر راہ پر مجھے نہ ملا راہ بر کوئی

گم کردہ راہ کے بجائے گمراہ کی اصلاح فرمائی گئی ہے یہ کام حضرت ہی کے کرنے کا تھا۔ شاید گم کردہ راہ اور گمراہ میں کوئی فرق نہیں؟

(۶) میری شیوہ نگاہیاں جائیں   تیری رسوا جمالیاں نہ گئیں

"شیوہ نگاہی کی ترکیب اگر صحیح مان بھی لیجائے تو جائیں غلط معلوم ہوتا ہے ختم ہو گئیں مٹ گئیں، ہونا چاہیے تھا"

سبحان اللہ سخن فہمی عالم بالا۔ فانی کی روح کہتی ہوگی ؎

کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم   ان متاعم کہ شود دست زدستے بے بصراں

حضرت کون کہتا ہے ختم ہو گئیں، مٹ گئیں، شاعر تو یہ کہہ رہا ہے کہ تیری رسوا جمالیاں تو گئی نہیں۔ مری شیوا نگاہیاں کیوں جائیں۔ شیوہ نگاہی کی ترکیب محض شاعر کے سمجھنے کی چیز نہیں یہ کام ادیب کا ہے یہ تصرف بھی ایک ادیب ہی کر سکتا تھا کہ شیوہ اور رسوا کے موقعہ کو بدلکر شعر میں بجلی کی رو دوڑا دی۔ اور بتا دیا کہ یہ کام وہی شاعر کر سکتا ہے جو ادیب کامل بھی ہو۔

(۷) فطرت غم رفتہ رفتہ میری فطرت بن گئی   اضطراب دل ہے فانی اضطراب دل مجھے

"دوسرا مصرعہ باعتبار مفہوم غلط ہے۔ اضطراب دل اضطراب دل ہے یہ کیا بات ہوئی۔ اضطراب دل ہے اے فانی سکون دل مجھے ہونا چاہیے۔"

زبان چاہیے اور سخن فہمی کے اور اصلاح کے۔ حضرتِ فارسی کی کوئی معمولی سی لغت اٹھا کر ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہو جائے کہ اضطراب اور اضطرار میں کیا فرق ہے اور پھر سمجھ میں آجائے گا کہ اضطرابِ دل اضطرارِ دل ہے کیا بات ہوتی ہے اضطرارِ دل کے معنی ہیں وہ فطری اور قدرتی حرکت قلب جو فریضۂ قلب ہے اور جس پر مدارِ حیات ہے۔ اضطرار کے معنی ہیں مجبوری، اور پابندی کا مفہوم ہے۔ اور اضطرابِ دل کے معنی ہیں بے چینی، بے تابی، یہ کیفیت بہ صورتِ مرض دل سے لاحق ہو سکتی ہے۔ اور ہوتی ہے۔ جب غم فطرت بن گیا تو اضطرابِ دل کی فطرت بن گیا یعنی اضطرار۔ اب آیا حضور کی سمجھ میں ؟

اب زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔ حاشا میری غرض علامہ موصوف کی اہانت نہیں۔ مدعا صرف اس قدر ہے کہ طالب علم نام اور بلند بانگ دعاوی سے مرعوب نہ ہو۔ اور یہ نہ سمجھ لے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب صحیح و درست ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ اس میں زیادہ نادرست اور کم صحیح ہے۔

فانی کے کلام میں بلند و پست ضرور ہے مگر اس کا حقیقی سبب یہ ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے خیال پر غور و تامل یعنی عقل کا تصرف اس قدر فرماتے ہیں کہ جذبہ اُس کی تاب نہ لا کر افسردہ ہو جاتا ہے اور نتیجہ میں شعر کی روح مضمحل۔

فانی نے متروکات استعمال کئے ہیں اس جملہ کو زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے کہ فانی نے داغ وغیرہم کے متروکات کا لحاظ نہیں کیا۔ متروکات کا

اتنا نہ ماننا کُلاًّ ذوق سے متعلق ہے کوئی علمی یا فنی غلطی نہیں متروکات میں ایک اسکول نے سو اور تہ کو بھی شامل کیا ہے۔ مگر آج تک کسی ادیب نے ان کے مرادف الفاظ پیش نہیں کئے۔ اور جو مفہوم ان لفظوں سے ادا ہوتا ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کے استعمال کو عجز سے تعبیر کرنا ظلم ہے۔

خضر عربی لغت ہے اور تینوں طرح سے جائز ہے۔ اس کا تعلق متروکات سے نہیں نہ کسی کے ترک و اختیار کا اس بارہ میں کوئی اثر۔

نئی ترکیبوں کے استعمال کے سلسلہ میں بھی بعض تنگ نظر ہمعصر فانی پر معترض ہوئے ہیں، ایک صاحب نے اعتراض کی زد میں "شوخ بے پروا خرام" کو بھی شامل کرلیا۔ بیدل کا یہ شعر نہ سنا ہوگا۔

شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس ... این قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

جو کھٹکا اس ترکیب کا ہے وہی بے نشان انجام کی ترکیب کا ہے۔

فانی کی حیثیتِ شاعری پر نظر کے سلسلہ میں یہ خاص بات بیان نہ کرنا بڑی بدمذاقی ہے گی کہ مرحوم نے اپنی فطرت کی تشریح، اپنی جہات کی تعبیر اپنے ذوق ادب کی نفاست اور اپنی کیفیاتِ قلبی کا اظہار کس نرالے انداز اور کس انوکھے پیرایہ میں ایک چھوٹے سے جملہ میں اپنے سال رحلت کے مادۂ تاریخ میں ادا کردیا کہ بیان نہیں ہوسکتا۔

فانی غالباً اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے خود اپنی رحلت کی تاریخ کہی۔ فرماتے ہیں۔

او از جہاں گزشت کہ آخر خدا نہ بود — او آنچناں بزیست کہ گوئی خدا نداشت
طغیان ناز ہیں کہ بہ لوح مزار او — ثبت است سال رحلت فانی خدا نداشت

۱۳۶۰ھ

فانی کی ادبیت اور سخن سنجی کی دلیل اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو خوبیاں بھی عیب نظر آئیں اور خدا پرستی کفر۔

یہ امر قابل اعتنا تو نہیں مگر ذکر کر دینا بے سود بھی نہیں کہ ایک لیڈی لیکچرار صاحبہ (مس تاج بیگم صاحبہ) فانی کے فلسفۂ غم اور اس کے مہلک اثرات پر بحث کرتے ہوئے فرماتی ہیں "ان کی طبیعت میں شدید تلخی آگئی تھی۔ اس تلخی کا اندازہ اس تاریخی مادہ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے اپنی موت کا نکالا تھا ؎

طغیان ناز ہیں کہ بہ لوح مزار او — ثبت است سال رحلت فانی خدا نداشت

خدا نداشت۔ یہی الفاظ فانی کی سب سے بڑی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک اچھے شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ غم ہستی کو شدید طور پر محسوس کرے لیکن بے صبر نہ ہو۔ اور بے صبری کی حالت میں خالق ہستی کے وجود سے انکار نہ کر بیٹھے"۔

اس شعر سے یہ نتیجہ نکالنا کہ خدا کے وجود سے انکار کیا گیا ہے یا کوئی گستاخی کی گئی ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ معترض کو شعر فہمی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ شاید طغیان ناز کے ٹکڑے پر نظریں نہیں گئیں یا معنی نہیں سمجھے گئے۔

ایک واقعہ یاد آ گیا جب ڈاکٹر اقبال کا "شکوہ" شائع ہوا ہے تو بعض مذہبی ٹھیکہ داروں نے اُن پر بھی ایسا ہی اعتراض کیا تھا۔ اور اعتراض کرنے والے اگرچہ بعض بزرگ تھے میں اس جواب پر مجبور ہو گیا تھا کہ کاش یہ لوگ قرآن پاک میں بعض پیغمبروں کے شکوہ پر نظر فرما لیتے اور یہ توفیق نہ تھی تو خاکم بدہن کی شعریت اور معنویت کو سمجھنے کی کوشش فرماتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ میں نے آپ کے سامنے فانیؔ کی تربیت، تعلیم افتادِ زندگی، اُن کی فطرت، اور عادت و خصلت، اُن کا مذاق طبیعت، بیان کر دیا، اور شعر و شاعری کے متعلق جو میرا ذاتی خیال و معیار تھا، فانیؔ پر لکھنے والوں میں جو قابلِ ذکر اصحاب تھے، اُن کی رائے سے مجھے کس حد تک اتفاق ہے، اور کس موقع پر نہیں، اور کیوں نہیں۔ یہ سب نسبتاً مشرح طور پر عرض کر دیا۔ اب یہ بیان کرنا کہ کلام فانیؔ اس معیار پر پورا اترتا ہے تحصیل حاصل ہو گی۔ میں نے ایک جملہ میں کہہ دیا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ فانیؔ کے اس چھوٹے سے مجموعۂ کلام میں زیادہ شعر ہیں اور کم ایسے ہیں جو میرے قائم کئے ہوئے معیار پر شاید پورے نہ اُتریں۔ میں فانیؔ کا ہموطن ہوں، دوست ہوں، اس لئے بعض اصحاب کو میرے بیان میں محبت کی کمزوریاں نظر آئیں گی۔ یہ بالکل ممکن ہے میں نے اپنی رائے ظاہر کی ہے میں کلام کا مطالعہ کرنے والے کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ حرف بحرف مجھ سے متفق ہو۔

ہیں یہ سنت رائج الوقت بھی ادا نہیں کرتا کہ منتخب اشعار کو بڑھا چڑھا کر پیش کروں۔ اور اس طرح اپنے دعاوی کی تائید اور دلائل کی تصدیق بہم پہنچاؤں۔ میں یہ کام مطالعۂ کلام کرنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔

کہیں ابھی ترے اشعار یا نہیں فانیؔ

ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

کمترین۔ ضیائے عباس ہاشمی

المرقوم

کراچی ۷ ؍ مارچ ۱۹۵۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف الف

ٹوٹا طلسمِ ہستیِ فانی کے راز کا
احسان مند ہوں المِ جاں گداز کا

تمہیدِ صد ہزار قیامت ہے ہر نفس
عنوانِ شوق ہوں گلہ ہائے دراز کا

عبرت سرائے دل میں ہوں آوازۂ ورباش
مارا ہوا ہوں خاطرِ حسرت نواز کا

اُٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظّارۂ جمال
مُنہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظّارہ ساز کا

ناآشنائے لطف ہوں بیگانۂ عذاب
صورت شناس ہوں نگہِ امتیاز کا

احساسِ غیر بادہ گوارا ہوا مجھے
لا جام ساقیا مے مینا گداز کا

فانی دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

بے اجل کام نہ اپنا کسی عنواں نکلا
دم تو نکلا مگر آزردۂ احساں نکلا

آ گئی ہے ترے بیمار کے منہ پر رونق
جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

دل آگاہ سے کیا کیا ہمیں امیدیں تھیں
وہ بھی قسمت سے چراغِ تہِ داماں نکلا

دل بھی تھا منہ سے بس اک آہ نکل جانے تک
آگ سینہ میں لگا کر غمِ پنہاں نکلا

چارہ گر ناصحِ مشفق دلِ بے صبر و قرار
جو ملا عشق میں غمخوار وہ ناداں نکلا

تجکو منظور نہیں تذکرۂ عشق نہ چھیڑ
کہ وہ در پردہ مرا حالِ پریشاں نکلا

بجلیاں شاخِ نشیمن پہ کبھی جاتی ہیں
کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی
چاکِ داماں بھی باندازۂ داماں نکلا

ہائے وہ وعدۂ فردا کی مدد وقتِ اخیر
ہائے وہ مطلبِ دشوار کہ آساں نکلا

شوقِ بیتاب کا انجام تحیر پایا
دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا

اس نے کیا سینۂ صد چاک سے کھینچا افغانی
دل میں کہتا ہوں وہ کہتا ہے کہ پیکاں نکلا

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

حُسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

کعبہ کو دل کی زیارت کیلئے جاتا ہوں
آستانہ ہے حرم میرے صنم خانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کر مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

اب اُسے دار پہ لیجا کے سُلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لیے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

وحدتِ حُسن کے جلوؤں کی یہ کثرت اے عشق
دل کے ہر ذرّے میں عالم ہے پریخانے کا

چشمِ ساقی اثرِ مے سے نہیں ہے گلرنگ
دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

لوحِ دل کو غمِ اُلفت کو قلم کہتے ہیں
کُن ہے اندازِ رقم حُسن کے افسانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

کس کی آنکھیں دمِ آخر مجھے یاد آئی ہیں
دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانیؔ
آپکی جان سے دور آپ کے مرجانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مَر مَر کے جیے جانے کا

کسی کے ایک اشارے میں کس کو کیا نہ ملا
بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیرِ مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

دبی زبان سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ
بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

خدا کی دین نہیں اے فنا خلق پر موقوف
یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا

دُعا گدائے اثر ہے گدا نہ نکتہ کر
کہ اعتمادِ اثر کیا ملا ملا نہ ملا

ظہورِ جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار
کوئی اجل کی طرح دیر آشنا نہ ملا

تلاشِ خضر میں مشکل کی رہ شناس خضر نہیں
مجھے یہ دل سے گلا ہے کہ رہ نما نہ ملا

نشانِ مہر ہے ہر ذرہ ظرفِ مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات
وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

وہ نامرادِ اجل بزمِ یاس میں بھی نہیں
یہاں بھی فانیِ آوارہ کا پتا نہ ملا

ہل گیا زنداں برا ہو نالۂ شب گیر کا / چونک اٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

میری تدبیروں کی مشکل اتنی یارب سہل کر / کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہیں تقدیر کا

میرے دل سے پوچھتے ہیں آپ کیا وجہِ خلش / یاد ہے گم ہو گیا تھا کوئی پیکاں تیر کا

عشق کا بھی کیا تصرف ہے کہ دل اب دل نہیں / آئینہ ہے غم کی جیتی جاگتی تصویر کا

آپ کی آزردگیِ بے سبب بھی خوب ہے / کیا مزے کا ہے تقاضا عذرِ بے تقصیر کا

کس نظر سے اس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف / کانپ اٹھا ہر ذرّہ میری خاکِ دامنگیر کا

برق کو اب کیا غرض کیا رہ گیا کیا جل گیا / جل گیا خرمن ہی جو کچھ تھا مری تقدیر کا

فکرِ راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی / ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

نامرادی حد سے گذری حالِ فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

یہ کس قیامت کی بیکسی ہے نہیں ہی اپنا نہ یار میرا
نہ خاطرِ بیقرار میری نہ دیدۂ اشکبار میرا

نشانِ تربت عیاں نہیں ہے نہیں کہ باقی نشاں نہیں ہے
مزار میرا کہاں نہیں ہے کہیں نہیں ہے مزار میرا

وصال تیرا خیال تیرا جو ہو تو کیوں کر نہ ہو تو کیوں کر
نہ تجھ پہ کچھ اختیار دل کا نہ دل پہ کچھ اختیار میرا

نگاہِ دل دوز کی دُہائی، جمالِ جاں سوز کی دُہائی
رہِ محبّت میں غم نے لُوٹا شکیبِ صبر و قرار میرا

میں دردِ فرقت سے جاں بلب ہوں تمہیں یقینِ وفا نہیں ہے
مجھے نہیں اعتبار اپنا، تمہیں نہیں اعتبار میرا

قدم نکال اب تو گھر سے باہر جو دم ابھی سینہ سے نکلے
دکھا نہ اب انتظار اپنا لحد کو ہے انتظار میرا

سُنا ہے اُٹھا ہے اک بگولہ جلو میں کچھ آندھیوں کو لیکر
طوافِ دشتِ جنوں کو شاید گیا ہے فانی غبار میرا

قربانِ عشق موت بھی آئی تو کب ہوا
اس تیرِ بے خطا کا نشانہ خطا ہوا

کیوں خونِ دل لگی ہی رہے گی جگر میں آگ
اے ننگِ عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا

قاتل سنبھل کہ یہ نگہِ واپسیں نہیں
خنجر ہے میرے دل کے لہو میں بجھا ہوا

اے جذبِ بیخودی ترے قربان جایئے
پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا

طوفاں ہی ایک کیا مجھے طوفاں سے کم نہیں
لنگر ہوا، سفینہ ہوا، ناخدا ہوا

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تونے دیا دل دکھا ہوا

فانی طلسمِ رازِ حقیقت ہے یہ کہ ہے
تجھ پر تری نگاہ کا پردہ پڑا ہوا

یہ ضبط بھی ادب آموزِ امتحاں نہ ہوا
کوئی ستم کبھی تقریبِ الاماں نہ ہوا

سبک سری ہے ترے عشق سے سبکدوشی
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

اجل کے زیرِ اثر ہو وہ نقشِ ہستی کیا
ہوا کہ برق کے سایہ میں آشیاں نہ ہوا

کسی کی پُرسشِ پنہاں سے کیوں ہو دادطلب
وہ حال جو کبھی منّت کشِ زباں نہ ہوا

فغاں نے کوئی اثر تو کیا یہ کیا کم ہے
یہی سہی کہ وہ آزردۂ فغاں نہ ہوا

دل آپ یار سے رُودادِ غم کہے تو کہے
مری زباں سے تو یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

جہاں میں جان نہیں یادِ یار دل میں نہیں
جمالِ یار کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

ہر آن فتنہ ہے، ہر فتنہ اک قیامت ہے
ترا شباب ہوا دورِ آسماں نہ ہوا

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانیؔ
ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا
دولتِ دو جہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا

قبر میں جب کسی طرح دل کی تڑپ نہ کم ہوئی
یادِ خرامِ ناز نے حشر کا آسرا دیا

روزِ جزا گلہ تو کیا شکرِ ستم ہی بن پڑا
ہائے کہ دل کے درد نے درد کو دل بنا دیا

اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں
آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی
آج نگاہِ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا

اُف کہ گناہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف
آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دُکھا دیا

آپ ہم اپنی آگ میں اے غمِ عشق جل بجھے
آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا جلا دیا

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا

گریۂ آتشیں کی داد دے شبِ غم تو کون دے
تو تو سرِ شام کیا بجھی شمع نے دل بجھا دیا

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیِ نا امید کو موت کا آسرا دیا

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بے قرار رویا
دشمن بھی چیخ اُٹھا بے اختیار رویا

کیا اس کو بیقراری یاد آ گئی ہماری
مل مل کے بجلیوں سے ابرِ بہار رویا

آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں
دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

نازک ہے آج شاید حالت مریضِ غم کی
کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں زار زار رویا

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اک بیقرار تڑپا اک دل فگار رویا

فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

کہتا ہے غمِ یار میں ہوں جانِ تمنّا
دُنیا ہے مری عالمِ امکانِ تمنّا

مضمون تو مکتوبِ ازل کا نہیں معلوم
لکّھا ہے مرے خون سے عنوانِ تمنّا

آہستہ گذر صرصرِ غم وادیٔ دل میں
برباد نہ کر خاکِ شہیدانِ تمنّا

جز داغ نہیں کوئی چراغِ سرِ تُربت
سینہ ہے مرا گورِ غریبانِ تمنّا

ہے یاد تری رونقِ خلوت گہِ خاطر
ہے ذکر ترا شمعِ شبستانِ تمنّا

نالے ہیں نہ آہیں نہ خلش ہے نہ تپش ہے
باقی نہ رہا کوئی زباں دانِ تمنّا

کیفیتِ ناکامیٔ دل کیا کہوں فانیؔ
دل ٹوٹ گیا ٹوٹ کے پیمانِ تمنّا

کچھ کم تو ہوا رنجِ فراوانِ تمنا
آغازِ جنوں گو نہیں پایانِ تمنا

پھر یاس نے رکھا ہے قدم خانۂ دل میں
یعنی ہے اب اللہ نگہبانِ تمنا

گو چاک ہوا دل مگر ارمان نہ نکلے
بے فائدہ کھولا درِ زندانِ تمنا

افسانہ مرا خوابِ زلیخائے محبت
جلوہ ہے ترا یوسفِ کنعانِ تمنا

جز وعدۂ باطل نہیں بنیاد کچھ اس کی
دل کانپ اٹھا دیکھ کے ایوانِ تمنا

اک جان ہے وہ خیر سے وارفتۂ غم ہے
اک دل ہے سو ہے سوختہ سامانِ تمنا

فانی کا دم اک دن ترے قدموں پہ نکل جائے
دل کی یہ تمنا ہے اب اے جانِ تمنا

مدّت سے ہے دل خانۂ ویرانِ تمنّا
اب کوئی تمنّا ہے نہ سامانِ تمنّا

سمجھو تو بہت فرق ہے اغیار میں مجھ میں
ہیں آپ پہ قربان وہ قربانِ تمنّا

پہلو بھی بدلنے نہیں پاتے مرے ارمان
اب ضبط سے دل ہے اُدبستانِ تمنّا

کیا چارہ گر اب بھی تجھے اُمّیدِ شفا ہے
یہ زخم ہے، یہ دل ہے، یہ پیکانِ تمنّا

آلودہ نہیں خونِ تمنّا سے وہ دامن
رنگیں ہے مرے خون سے دامانِ تمنّا

اللہ بچائے نظرِ یاس سے دل کو
اُمید ہے پھر سلسلہ جنبانِ تمنّا

یہ سحر ہے فانیؔ کہ غمِ عشق ہے کیا ہے
دل قطرۂ خوں جس میں یہ طوفانِ تمنّا

وائے نادانی یہ حسرت تھی کہ ہوتا در کھُلا
ہمقفس رازِ اسیری کیا کہیں کیوں کر کھُلا

فرصتِ رنجِ اسیری ہی نہ اُن دھڑکوں نے ہائے
اب چھُری صیّاد نے لی اب قفس کا در کھُلا

اللہ اللہ اک دُعائے مرگ کے دوڑ دوڑ اثر
واں کھُلا بابِ اجابت یاں قفس کا در کھُلا

اُف اس آزادیٔ بے ہنگام کی مجبوریاں
ہیں قفس کے پاس یوں بیٹھا ہی رہتا پر کھُلا

عجلتِ پرواز جب ملنے بھی دے راہِ گریز
یوں تو کھلنے کو قفس کا در کھُلا اکثر کھُلا

بند ہے بابِ قفس۔ ہو۔سر تو پٹکے جایئے
ہم نے دیکھا ہے قفس کی تیلیوں میں در کھُلا

کم تو کیا صیّاد بے تابی سوا ہو جائے گی
تو نے ناحق تیلیوں میں رکھ دیا خنجر کھُلا

آسماں گرمِ تلافی چاہیے کیسا قفس
بجلیوں کے اک اشارے میں قفس کا در کھُلا

ہجرِ ساقی میں ہمارے گھر کی کیفیت نہ پوچھ
بند در، ہر شیشہ خالی، دل بھرا، ساغر کھلا

لکھ چکے ہم جا بجا خط گر یہی حالت رہی
ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھُلا

دل میں زخم اتنے کہاں ہیں جس صورت ہیں حالِ پرس
وہ نگہ اُف وہ مژہ ناوک چھپا نشتر کھُلا

دم بخود سکتے کا عالم مُردنی چھائی ہوئی
رنگ میری زندگی کا میری میّت پر کھُلا

دیکھیے کیا گل کھلاتی ہے بہار اب کی برس
خواب میں فانیؔ نے دیکھا ہے قفس کا در کھُلا

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھُلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیئے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدّت گزری چھُوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

حاصلِ علمِ بشر جہل کا عرفاں ہونا
عمر بھر عقل سے سیکھا کیئے ناداں ہونا

چار زنجیرِ عناصر پہ ہے زنداں موقوف
وحشتِ عشق ذرا سلسلہ جنباں ہونا

دل بس اک لرزشِ پیہم ہے سراپا یعنی
تیرے آئینہ کو آتا نہیں حیراں ہونا

فالِ افزونیِ مشکل ہے ہر آسانیِ کار
میری مشکل کو مبارک نہیں آساں ہونا

راحتِ انجامِ غم و راحتِ دنیا معلوم
لکھدیا دل کے مقدّر میں پریشاں ہونا

دے ترا حسنِ تغافل جسے چاہے جو فریب
ورنہ تو اور جفاؤں پہ پشیماں ہونا

ہائے وہ جلوۂ ایمن وہ نگاہِ سرِ طور
فتنہ ساماں سے ترا فتنہ ساماں ہونا

خاکِ فانی کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں
کس سے سیکھا ترے ذرّوں نے بیاباں ہونا

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گزر گیا — عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیرانِ زندگی — یعنی جمالِ یار کا صدقہ اُتر گیا

دُنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ — بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

شاید کہ شامِ ہجر کے مارے بھی جی اُٹھے — صبحِ بہارِ حشر کا چہرہ اُتر گیا

آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں — یہ جانتا ہوں دل اِدھر آیا اُدھر گیا

میں نے دیا کہ تم نے لیا دل تمہیں کہو — تم دل میں پہلے آئے کہ دل پیشتر گیا

ہاں سچ تو ہے شکایتِ زخمِ جگر غلط — دل سے گزر کے تیر تمہارا کدھر گیا

دل کا علاج کیجئے اب یا نہ کیجئے — اپنا جو کام تھا وہ غمِ یار کر گیا

کیا کیجئے اپنی گرم رَوِی ہائے شوق کو — کچھ دور میرے ساتھ مرا راہبر گیا

فانی کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود
شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

سایہ بھی جب پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا — کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اُجڑ گیا

تو نے سب اپنے کام بگڑ کر بنا لیے — میری وفا وہ کام جو بن کر بگڑ گیا

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے — اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

صیّاد یوں پروں میں گرہ باندھتے ہیں کیا — بے درد بند بند کسی کا جکڑ گیا

ہوتا ہے آج فیصلہ اُمید و یاس کا — مٹتا ہے اب وہ دل جو بسا اور اُجڑ گیا

بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کیے بغیر — کام اُن کی بیقرار نگاہوں سے پڑ گیا

بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ — کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا

اللہ رے جوشِ بادِ بہاری ترا اثر — پیمانہ لڑکھڑا کے صراحی سے لڑ گیا

وعدے کی رات گردشِ افلاک رُک گئی — جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

اک حشر اور چاہیے اس روسیاہ کو
فانیؔ زمینِ حشر میں غیرت سے گڑ گیا

اے اجل، اے جانِ فانیؔ تو نے یہ کیا کر دیا
مار ڈالا مرنے والے کو کہ اچھا کر دیا

جب ترا ذکر آ گیا ہم دفعتاً چپ ہو گئے
وہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا

یوں چرائیں اُس نے آنکھیں سادگی تو دیکھیے
بزم میں گویا مری جانب اشارا کر دیا

دردمندانِ ازل پر عشق کا احساں نہیں
درد، یاں دل سے گیا کب تھا کہ پیدا کر دیا

دل کو پہلو سے نکل جانے کی پھر رٹ لگ گئی
پھر کسی نے آنکھوں آنکھوں میں تقاضا کر دیا

بچ رہا تھا ایک آنسو دار و گیرِ ضبط سے
جوششِ غم نے پھر اس قطرے کو دریا کر دیا

فانیؔ مہجور تھا آج آرزو مندِ اجل،
آپ نے آ کر پشیمانِ تمنّا کر دیا

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اِک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشرِ سکوت
تیرے شہیدِ ناز کا ماتم خموش تھا

اُمیدِ عفو ہے ترے انصاف سے مجھے
شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

فردائے حشر خیر سے آنکھوں کا تھا قصور
ہر رُخ مری نگاہ کا تصویرِ دوش تھا

ہر مژدۂ نگاہِ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا

وحشت بقیدِ چاک گریباں روا نہیں
دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

پی اور وہ پی ازل میں کہ اُترے نہ حشر تک
یادش بخیر دل بھی عجب بادہ نوش تھا

محرومیاں ذریعۂ الہام ذکر تھیں
نالوں پہ انحصارِ پیامِ سروش تھا

فانیؔ تنک بضاعتیِ غم کا کیا علاج
ہر قطرہ خونِ دل کا تمنا فروش تھا

خونِ ناحق کا گلہ تھا کچھ ادب کا جوش تھا
لاش کی صورت زباں تھی اور میں خاموش تھا

نورِ برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے
ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ بیہوش تھا

ہائے کیا دن ہیں کہ نقشِ سجدہ ہے اور سر نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبالِ دوش تھا

عشق کی دُنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی
تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

دل کی ہر کروٹ میں اک دُنیا بنی اور مٹ گئی
ہائے ان دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش تھا

سرگذشتِ عمر کہیے اس کو یا رودادِ عشق
دل کے لب جنبش میں تھے اور میں سراپا گوش تھا

کیا یہ فانیؔ کر رہا تھا عالمِ ہستی کی سیر
آگے آگے بیخودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

خوشی سے رنج کا بدلا یہاں نہیں ملتا
وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا

ہزار ڈھونڈھیے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

بتا اب اے جرسِ دور میں کدھر جاؤں
نشانِ گردِ رہِ کارواں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

کسی نے تجکو نہ جانا مگر یہ کم جانا
یہ راز ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

مجھے عزیز سہی قدرِ دل تمھیں کیوں ہو
کمی تو دل کی نہیں دل کہاں نہیں ملتا

دیارِ عمر میں اب قحطِ مہر ہے فانی
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اُٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دُھواں دل سے اُٹھا

جلوہ محسوس سہی، آنکھ کو آزاد تو کر،
قیدِ آدابِ تماشا بھی تو محفل سے اُٹھا

پھر تو مضرابِ جنوں سازِ انا لیلےٰ چھیڑ
ہائے وہ شورِ انا القیس کہ محمل سے اٹھا

اختیار ایک ادا تھی مری مجبوری کی
لطفِ سعیٔ عمل اس مطلبِ حاصل سے اٹھا

عمرِ اُمّید کے دو دن بھی گراں تھے ظالم
بارِ فردا نہ ترے وعدۂ باطل سے اٹھا

خبرِ قافلۂ گم شدہ کس سے پوچھوں
اک بگولہ بھی نہ خاکِ سرِ منزل سے اٹھا

ہوش جب تنگ ہے گلا گھونٹ کے مرجانے کا
دمِ شمشیر کا احساں ترے بسمل سے اٹھا

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں نہ اٹھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

کس کی کشتی تہِ گردابِ فنا جا پہنچی
شورِ لبیک جو فانیؔ لبِ ساحل سے اٹھا

نذرِ دردِ دل غمِ دنیا کیا — اک مٹایا داغ اک پیدا کیا
رونمائے جوشِ حیرت تھی نگاہ — آئینہ منہ آپ کا دیکھا کیا
بجلیاں بھر دیں نگاہِ یار میں — تو نے آہِ آتشیں یہ کیا کیا
وسعتِ دل تھی بقدرِ دادِ عشق — قطرہ دریا تھا جسے دریا کیا
نالہ کیا ہاں اک دھواں سا شامِ ہجر — بسترِ بیمار سے اٹھا کیا
سخت نازک تھا مزاجِ دردِ عشق — دل فدائے حسنِ بے پروا کیا

زیست تھی بیکار فانیؔ دل کے بعد
جان بھی قربان کی اچھا کیا

جمالِ خود رُخِ بے پردہ کا نقاب ہوا
نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا

مِلا ازل میں مجھے میری زندگی کے عوض
وہ ایک لمحۂ ہستی کہ صرفِ خواب ہوا

سکونِ قلب میسّر ہے موت ہی سے سہی
غرض کہ خاتمۂ رنج و اضطراب ہوا

وہ جلوہ مفتِ نظر تھا نظر کو کیا کہیئے
کہ پھر بھی ذوقِ تماشا نہ کامیاب ہوا

اُلٹ گئی مری اُمّید و بیم کی دُنیا
یہ کیا نظامِ تمنّا میں اِنقلاب ہوا

گناہگار سہی دل مگر قصور معاف
ظہورِ شوق بہ اندازۂ حجاب ہوا

فضا کو مژدۂ فرصت کہ فانیٔ مہجور
شہیدِ کشمکشِ صبر و اضطراب ہوا

جلوۂ عشق حقیقت تھی حسنِ مجاز بہانہ تھا
شمع جسے ہم سمجھے تھے شمع نہ تھی پروانہ تھا

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھُلی تو دُنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

عہدِ جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جب تک مر جانے کا زمانہ تھا

دل اب دل ہے خدا رکھے ساقی کو میخانے کو
ورنہ کسے معلوم نہیں ٹوٹا سا پیمانہ تھا

فانی گو کیسا ہی سہی پھر بھی تجھی سے نسبت تھی
دیوانہ تھا۔ تھا کس کا۔ تیرا ہی دیوانہ تھا

بوئے خزاں سے مست ہیں یادِ چمن بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

دل ہے تری نگاہ تک جان ہے ایک آہ تک
حوصلۂ امید کیا ظرفِ امیدوار کیا

محوِ فروغِ ذات ہوں بیخبرِ صفات ہوں
کوئی ہو شمعِ بزم کیا شمعِ سرِ مزار کیا

ہوش سے احتراز کر فاشِ نہ غم کا راز کر
دغدغۂ حساب کیوں شکوۂ روزگار کیا

حد سے سوا جفا سہی مجھ پہ ہے غیر پر نہیں
جوششِ سیلِ گریہ کون ضبط کو ناگوار کیا

جو غمِ بے اثر نہ ہو جو شبِ بے سحر نہ ہو
وہ غمِ انتظار کب وہ شبِ انتظار کیا

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا

کھیل تھا سب امید کا یہ نہ رہی تو کچھ نہ تھا
آرزوؤں کی کیا بساط شوق کا کاروبار کیا

فانی اب اپنی زندگی حسنِ عتابِ یار ہے
دیکھیے مرگِ ناگہاں لائے پیامِ یار کیا

میں نے ظلمت جان کر خوش ہوتی منظر دیکھنا
وہ مجھے تڑپا کے تیرا پھر نہ مُڑ کر دیکھنا

دیدنی ہے رنگ دل میں ڈوب کر کھنچنے کے بعد
تم ابھی کیا دیکھتے ہو تم کے خنجر دیکھنا

ذکرِ خورشیدِ قیامت حُسن کے واعظ کیا کہوں
خیر اس تیرہ دامنی کو روزِ محشر دیکھنا

ماسوائے دل میں اک ہنگامہ برپا کر دیا
چشمِ کافر کا وہ دل لے کر مکرر دیکھنا

سانس کے جو آخری جھٹکوں میں ٹکڑے ہو گئیں
ہائے اُن ناشاد آہوں کا مقدر دیکھنا

تیرے دل کو چین آ جانے کی ضامن موت ہے
تم کسی دن نبضِ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا

مُژدہ فصلِ گل کا لائے تو ہی بادِ بہار
ہر کڑی زنجیر کی زنداں سے باہر دیکھنا

جب ذرا پردے سے جھانکا بجلیاں گرنے لگیں
ہے یہ کوئی دیکھنے ہیں بندہ پرور دیکھنا

تشنہ لب بھی تھا میں ساقی جان سے بیزار بھی
ساغر اور پھر زہر سے لبریز ساغر دیکھنا

صبح تک فانی ہر آوازِ شکستِ دل کے ساتھ
کیا قیامت تھا وہ تیرا جانبِ در دیکھنا

جمالِ بے حجاب تھا کہ جلوہ تھا حجاب کا
کلیمِ برقِ طور تھی کہ تار تھا نقاب کا

بتائیے نہ حالِ دل نہ حال پوچھتا ہوں میں
مآل پوچھتا ہوں میں دلِ وفا خراب کا

تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گِل
کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

خطابِ روزِ حشر کی صدائے بازگشت ہوں
جوابِ بے سوال ہوں سوالِ بے جواب کا

جہانِ بے سکون میں سکون ہی سکون تھا
مری نگاہِ مضطرب ہے راز انقلاب کا

وہ صرف صد یقیں سہی حیات پھر حیات ہے
کہاں سے لاؤں اعتبار مرگِ کامیاب کا

کمالِ ہوش ہے یوں بے نیازِ ہوش ہو جانا
تری آغوش میں بیگانۂ آغوش ہو جانا

ہمیں تیری محبّت میں فقط دو کام آتے ہیں
جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہو جانا

وہی برقِ تجلّی کارفرما اب بھی ہے لیکن
نگاہوں کو میسّر ہی نہیں بیہوش ہو جانا

شبِ وعدہ خدا ناکردہ وہ آئیں نہ موت آئے
تو پھر اے زندگی تو موت کا آغوش ہو جانا

خدا رکھے شرارِ عشق کو وہ شمعِ سوزاں ہوں
جلے جانا جسے ممکن ہے یا خاموش ہو جانا

بہار اپنی چمن اپنا قفس کی تیلیوں تک ہے
مبارک نکہتِ گل کو چمن بردوش ہو جانا

خدا دشمن کو بھی یہ خوابِ محرومی نہ دکھلائے
ادھر ایمائے پرسش اور ادھر خاموش ہو جانا

قیامت ہے یہ ٹکڑا داستانِ عشق کا یعنی
مرے راحت طلب دل کا اذیّت کوش ہو جانا

مُرقّع ہے کسی کی ہستیٔ موہوم کا فانی
وہ اُن کا دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جانا

جلوہ گاہِ نازِ جاناں جب مرا دل ہو گیا
سامنا فانیؔ مجھے دل کا بھی مشکل ہو گیا

مژدۂ تسکیں سے بے تابی کے قابل ہو گیا
دل پہ جب تیری نگاہیں جم گئیں دل ہو گیا

کر کے دل کا خون کیا بتیا بیاں کم ہو گئیں
جو لہو آنکھوں سے دامن پہ گرا دل ہو گیا

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

طور نے جل کر ہزاروں طور پیدا کر دئے
ذرہ ذرّہ میرے دل کی خاک کا دل ہو گیا

موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا

دردِ فرقت کی خلش وابستۂ انفاس تھی
مدعائے زندگانی مر کے حاصل ہو گیا

دل سراپا درد تھا وہ ابتدائے عشق تھی
انتہا یہ ہے کہ فانیؔ درد اب دل ہو گیا

یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا
اِس بزم میں ہُشیار ہوا بھی نہیں جاتا

کہتے ہو کہ ہم وعدہ پرسش نہیں کرتے
یہ سُن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا

دُشواریِ انکار سے طالب نہیں ڈرتے
یوں سہل تو اقرار ہوا بھی نہیں جاتا

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غمخوار ہوا بھی نہیں جاتا

جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں
اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

غم کیا ہے اگر منزلِ جاناں ہے بہت دُور
کیا خاکِ رہِ یار ہوا بھی نہیں جاتا

دیکھا نہ گیا اُس سے تڑپتے ہوئے دل کو
ظالم سے جفا کار ہوا بھی نہیں جاتا

یہ طرفہ سِتم ہے کہ سِتم بھی ہے کرم بھی
اب خوگرِ آزار ہوا بھی نہیں جاتا

سرِ ہوش برق گرتی وہ ہجومِ ناز ہوتا
وہ نظر فریب جلوہ جو نظر نواز ہوتا

خبر اپنی مغفرت کی تو نہیں یہ جانتا ہوں
مری توبہ چاہتی ہے درِ توبہ باز ہوتا

مرے شوق نے سکھایا اُسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا

وحشتِ عشق نے جب ہوش میں لانا چاہا
عقلِ کج فہم نے دیوانہ بنانا چاہا

ہم کو مرنا بھی میسّر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دوروزہ کا بہانا چاہا

پھر کچھ اے بیخبری تجھ میں کمی ہوتی ہے
درد نے کیا بجھے پھر ہوش میں لانا چاہا

تری ترچھی نظر کا تیر ہے مشکل سے نکلے گا
دل اس کے ساتھ نکلے گا اگر یہ دل سے نکلے گا

شبِ غم میں بھی میری سخت جانی کو نہ موت آئی
ترا کام اے اجل اب خنجرِ قاتل سے نکلے گا

نگاہِ شوق میرا مدعا تواں کو سمجھا دے
مرے منہ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلے گا

کہاں تک کچھ نہ کہئیے اب تو نوبت جان تک پہنچی
تکلف برطرف اے ضبط نالہ دل سے نکلے گا

تصور کیا ترا آیا قیامت آ گئی دل میں
کہ اب ہر ولولہ باہر مزارِ دل سے نکلے گا

نہ آئیں گے وہ تب بھی دم نکل ہی جائیگا فانیؔ
مگر مشکل سے نکلے گا بڑی مشکل سے نکلے گا

جگر خراش ہے حال ان تباہ حالوں کا
جنہیں مٹا کے رہا حوصلہ خیالوں کا

کیا سوال تو آوازِ بازگشت آئی
جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا

جنونِ شکوۂ بیداد پر خدا کی مار
اثر کے ساتھ گیا اعتبار نالوں کا

تعیّنات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانی
زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا

حجاب اگر من و تو کا نہ درمیاں ہوتا
پیامِ حسن و محبت کی داستاں ہوتا

تری تلاش کا افسانہ گر بیاں ہوتا
رہِ مجاز کا ہر ذرہ اک زباں ہوتا

مرا وجود ہے میری نگاہِ خود نشناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا

کمالِ ضبطِ غمِ عشق اے معاذ اللہ
کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیاں ہوتا

بنائے جلوہ گہِ ناز ہے جبینِ نیاز
جو دردِ عشق نہ ہوتا تو دل کہاں ہوتا

تمام قوتِ غم صرفِ دل ہوئی ورنہ
زمیں زمیں ہی نہ ہوتی نہ آسماں ہوتا

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار
نہ موجِ بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز
کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

مٹا دیا غمِ فرقت نے ورنہ میں فانیؔ
ہنوز ماتمئ مرگِ ناگہاں ہوتا

محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہو جا غیرت ہو تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا

اے شوقِ طلب بڑھ کر مجنونِ ادا ہو جا اے ہمّتِ مردانہ راضی برضا ہو جا

آغوشِ فنا میں ہم پروردۂ آفت ہیں اے فتنۂ دوراں اُٹھ اے حشر بپا ہو جا

ضد اور یہ ضد اے دل اچھا تو خدا حافظ قرباں ہی اس بت پر ہوتا ہے تو جا ہو جا

اس جانِ تمنّا سے بے پردہ نہ شکوہ کر وہ تجھ سے خفا ہے تو جینے سے خفا ہو جا

ہر قافلۂ دل کو تو مژدۂ منزل دے ہر رہگذرِ غم میں نقشِ کفِ پا ہو جا

یہ دردِ محبّت بھی کیا شئے ہے معاذ اللہ میں دردِ محبت سے کہتا ہوں سوا ہو جا

ظالم کا نہ شکوہ کر ظلموں کی نہ پروا کر تو اپنی وفاؤں کی غربت پہ فدا ہو جا

اِس ہستیٔ فانی سے کر قطع نظر فانیؔ
تو دوست کا طالب ہے دشمن سے جدا ہو جا

ردیف ب

پھر دلِ بیتاب ہے آرامِ جانِ اضطراب
پھر تمنا ہے کسی کی میہمانِ اضطراب

ہم ہوئے جاتے ہیں قائل آہ کی تاثیر کے
اس نے کیا کہہ کر بڑھا دی آج شانِ اضطراب

کب سے آغوشِ لحد میں ہم ہیں سرتا پا قرار
وہ ستم پرور ہے اب تک بدگمانِ اضطراب

مجھکو مضطر دیکھ کر ان کو حجاب آنے لگا
ہو چلی ہیں وہ نگاہیں رازدانِ اضطراب

اشک اک اک کر کے سب آسودۂ دامن ہو گئے
رفتہ رفتہ مٹ گیا نام و نشانِ اضطراب

وقتِ عرضِ حالِ دل اس فکر نے مارا مجھے
کیجئے آغاز کیوں کر داستانِ اضطراب

اضطرابِ دل کے شکووں نے کیا الٹا اثر
بے نیازِ نطق ہے گویا زبانِ اضطراب

رازِ ضبطِ غم الٰہی کس نے افشا کر دیا
ہے انہیں میری خوشی پر گمانِ اضطراب

سینۂ فانی ہے یا جولاں گہِ برقِ فنا
دل ہے یا رب یا بلائے آسمانِ اضطراب

عشق ہے پرتوِ حُسنِ محبوب
آپ ہی اپنی تمنا کیا خوب

طلبِ محض ہے سارا عالم
کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

قلب، ادراک، دماغ اور حواس
مجھ سے منسوب ہیں تجھ سے مغلوب

ردیف د

فغاں کے پردے میں سن میری داستاں صیاد — کہ پھر رہے نہ رہے طاقتِ بیاں صیاد
ترا اشارہ ترا ساز برق سے نہ سہی — تجھے خبر ہے کہ جلتا ہے آشیاں صیاد
نہ آ قریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں — بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد
بس ایک آہِ جہاں سوز کے اثر تک ہیں — یہ خار۔ برق۔ قفس۔ دام آسماں صیاد
نکل ہی جائیں گے نالے دہن سے خوں ہو کر — زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زباں صیاد
ستم رسیدۂ آوازۂ بیاں ہوں میں — قفس میں کھینچ کے لائی مری بیاں صیاد
چمن میں دل ہے، تو میری نگاہ میں ہے چمن — چمن سے تو مجھے لیجائے گا کہاں صیاد

یہ جذبِ ذوقِ اسیری ہے ورنہ اے فانیؔ
کہاں میں سوختہ دل مشتِ پر کہاں صیاد

کیا کہئے کہ بیداد ہے تیری بیداد
طوفانِ محبت کی ہے زد میں فریاد
دل محشرِ بیخودی ہے اللہ اللہ
یاد اور کسی بھولنے والے کی یاد

پابندیٔ رسم برطرف کیوں اے موت
اُن کے بھی کئے ہیں تو نے قیدی آزاد
اللہ یہ بجلیاں نہ کام آئیں گی
آندھی سے کیوں ہو آشیانہ برباد
دُنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانیؔ
ہے ایک طلسمِ اجتماعِ اضداد

ردیف (ر)

حیراں ہوں رنگِ عالمِ تصویر دیکھ کر
کیا یاد آ گیا مجھے زنجیر دیکھ کر

قسمت کے حرف سجدۂ در سے مٹا تو دوں
دل کانپتا ہے شوخیِ تحریر دیکھ کر

ہے ہے وہ اہلِ ذوق کی زنداں نوازیاں
سر پیٹتا ہوں خانۂ زنجیر دیکھ کر

وہ بیوفا جفا سے بھی اب آشنا نہیں
کیا منفعل ہوں آہ کی تاثیر دیکھ کر

فانیؔ وداعِ ہوش ہی کرنا پڑا مجھے
تن سے وداعِ روح میں تاخیر دیکھ کر

عشق عشق ہو شاہد حسن میں فنا ہو کر — انتہا ہوئی غم کی دل کی ابتدا ہو کر

دل نہیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر — عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر

نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں — سانس بن گیا ایک ایک نالہ نارسا ہو کر

اب ہوئی زمانہ میں شیوۂ وفا کی قدر — عالم آشنا ہے وہ دشمن وفا ہو کر

اور بندے ہیں جن کو دعویٰ خدائی ہے — تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

عمر خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں — زندگی نئی پائی آپ سے جدا ہو کر

بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں — درد بہر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

بندۂ خدائی ہے مدعی خدائی ہے — بندے نے خدائی کی بندۂ خدا ہو کر

کارگاہِ حسرت کا حشر کیا ہوا یا رب — داغِ دل پہ کیا گزری نقشِ مدعا ہو کر

عشق سے ہوئے آگاہ صبر کی بھی حد دیکھی — خاک میں ملا دو گے دیر آشنا ہو کر

کی قضائے مبرم نے زندگی کی غمخواری — درد کی دوا پہنچی دردِ بے دوا ہو کر

زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل
موت کو منالو گے جان سے خفا ہو کر

کر نہ فریاد خموشی میں اثر پیدا کر
درد بن کر دلِ بے درد میں گھر پیدا کر

میں دُعا موت کی مانگوں تو اثر پیدا کر
ورنہ یارب شبِ فرقت کی سحر پیدا کر

نہ میں جا سطح سے تو قطع نظر کر کے دیکھ
قطرے قطرے میں سمندر ہے نظر پیدا کر

جتنے غم چاہے دیئے جا مجھے لیکن یارب
ہر نئے غم کے لیئے تازہ جگر پیدا کر

یا اسے کر کسی بجلی کے حوالے یارب
یا مرے نخلِ تمنّا میں ثمر پیدا کر

دلِ مایوس کو اے عہدِ کرم شاد نہ کر
ناز پروردۂ غم ہے اسے برباد نہ کر

اے تقاضائے خرد مجھ پہ یہ بیداد نہ کر
میں ہوں دُنیائے محبّت مجھے برباد نہ کر

رُوح اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے
تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

غم ہستی ہی سہی ہو ترے سوا کوئی ہو
دل کی بستی ہے تری غیر سے آباد نہ کر

خامشی عین فغاں ہونے نہ پائے اے دل
اور جو فریاد ہی کرنا ہے تو فریاد نہ کر

صبر شایانِ محبّت تو نہیں ہے لیکن
شکر گر بن نہ پڑے شکوۂ بیداد نہ کر

دل کی حد سے اثرِ زیست نہ گزرے فانیؔ
ہوش لازم ہے مگر ہوش کو آزاد نہ کر

ردیف (ز)

کون اُٹھائے مری وفا کے ناز
دل ستم دوست وہ رقیب نواز

اب نئے سر سے چھیڑ پردہ ساز
یہیں ہی تھا ایک دُکھ بھری آواز

کھُل گیا میری زندگی کا راز
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

صور و منصور و طور ارے توبہ
ایک ہے تیری بات کا انداز

دیکھیے کیا ہو عشق کا انجام
دل کی ہستی ہے موت کا آغاز

رہ گئی تھی جو بازوؤں میں سکت
ہو گئی صرفِ ہمتِ پرواز

آج روزِ وصالِ فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

دور سے جاہتا کے سر حدِ ناز
دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم
میری ہستی ہے غیب کی آواز

ہوں اسیرِ فریبِ آزادی
پَر ہیں اور مشقِ حیلۂ پرواز

آج اچھے نہیں الہٰی خیر
درد کے تیور آہ کے انداز

کیوں فلک انتہا ہوئی کہ نہیں
ایک دم رہ گیا ہے اب دم ساز

ہے کوئی شے تو یار و جلوۂ یار
یہ حقیقت ہے اور یہ اصل مجاز

ہاں یہاں کوئی شے نہیں باطل
عشق ہے راز عقل پردۂ راز

اپنی صبر آزما نظر کو سنبھال
ہم ہیں مجبورِ آہِ صبر گداز

جانِ فانیؔ ترے کرم پہ نثار
تو نے بخشی حیات مرگ نواز

اللہ اللہ یہ شانِ کشتۂ ناز
ہے مری خاک سجدہ گاہِ نماز

ہاں شبِ ہجر آج صبح نہ ہو
ہاں چلی جائے یادِ زلفِ دراز

دھیان تیرا بہشتِ شوق سہی
دلِ عاشق ہے ایک دوزخِ راز

چشمِ حاسد مجھے نہ دیکھ سکی
ہوں ذلیلِ بلندیٔ پرواز

آج پہلو میں کیوں ہے سنّاٹا
کیا ہوئی آہ آہ کی آواز

راس آئے ہیں اشک و آہ کسے
گر نہ آب و ہوائے غم سے ساز

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے
تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

ہم ہیں اور عزمِ آشیاں یعنی
رہ گئی دور طاقتِ پرواز

ہے کہ فانیؔ نہیں ہے کیا کہیے
راز ہے بے نیازِ محرمِ راز

ردیف (ش)

دل چرا کر نگاہ ہے خاموش
ہوش اور مست ہو کے اتنا ہوش

مست کو چاہیئے بلا کا ہوش
خم دیئے اور دیا نہ اذنِ خروش

ہر مسافر سے پوچھ لیتا ہوں
خانہ برباد ہوں کہ خانہ بدوش

ہوسِ جلوہ اور نظر غافل
کہ نظر ہے صلائے جلوہ فروش

شاید اب منزلِ عدم ہے قریب
یادِ خاکِ وطن ہے طوفاں جوش

فضل تیرا شفیعِ طاعت و زہد
عدل عاصی نواز عصیاں پوش

ہجر نے کی مفارقت فانیؔ
لے مبارک ہو موت کا آغوش

برہم ہے میری ذات سے سارا نظامِ عیش
ٹوٹا ہے میرے عہد میں نیرنگِ نامِ عیش

اب احتیاجِ شکوۂ اختر نہیں مجھے
مینائے خونِ عیش سے بھرتا ہوں جامِ عیش

گلشن صلائے عامِ اسیری ہے سربسر
پھیلا دیا بہار نے پھولوں پہ دامِ عیش

میں ہوں اک مرکزِ ہنگامۂ ہوش و رمِ ہوش
دل اگر عالمِ مستی ہے تو سر عالمِ ہوش

عدمِ ہوش پہ ہے فطرتِ ہستی مائل
کس توقع پہ اٹھائے کوئی نازِ غمِ ہوش

بے خودی مایۂ عرفانِ خودی ہے یعنی
محرمِ جلوۂ اسرار ہے نامحرمِ ہوش

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالمِ مستی وہ ترا عالمِ ہوش

مظہرِ ہستی و خلّاقِ عدم ہے میری ذات
کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلۂ برہمِ ہوش

عجب ایک سانحۂ ہوش ربا تھی وہ نگاہ
میں ہوں اک عمر سے فانیؔ ہمہ تن ماتمِ ہوش

ردیف (غ)

لبِ منزلِ فغاں ہے نہ پہلو مکانِ داغ
دل رہ گیا ہے نام کو باقی نشانِ داغ

اے عشق خاکِ دل پہ ذرا مشقِ فتنہ کر
پیدا کر اس زمیں سے کوئی آسمانِ داغ

دل کچھ نہ تھا تمہاری نظر نے بنا دیا
دُنیائے درد، عالمِ حسرت، جہانِ داغ

پہلے اجل کو رخصتِ تلقینِ صبر دے
پھر آخری نگاہ سے سُن داستانِ داغ

وہ تیری بزم تھی نہ ملی جس میں چپ کی داد
یہ حشر ہے یہاں تو کھلے گی زبانِ داغ

ہم سادہ دل ہیں خوش کہ ہوئی نذرِ دل قبول
اس بدگماں کو مدِّ نظر امتحانِ داغ

سارا ملال پیار کی نظروں سے مٹ گیا
ان رہزنوں نے لوٹ لیا کاروانِ داغ

فانیؔ زمینِ گورِ غریباں ہے لالہ زار
پھر فصلِ گل میں خاک ہوئی ترجمانِ داغ

ردیف (گ)

سیکھئے دل کے چھیننے کے ڈھنگ
نہ گئی دل کے ساتھ دل کی اُمنگ

دل ہے اور سحر سازیٔ ادراک
آنکھ ہے اور فریبِ گردشِ رنگ

تیغِ قاتل تری دُھائی ہے
میری موت اور یہ دستبرد و رنگ

دین و دُنیائے دیدۂ و دل ہیں
بزمِ صد رنگ و جلوۂ بے رنگ

شمع ہوں بے نیازِ ظلمت و نور
آئینہ ہوں بغیرِ صیقل و زنگ

میں ہوں عالم بیدلی کا پیام
خیر و شر مدعا نہ صلح و جنگ

رازِ نیرنگیٔ حقیقت ہوں
میں ہوں فانیؔ حقیقتِ نیرنگ

ردیف (م)

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار ہیں ہم
بیخودی کچھ تو بتا کس کے طلبگار ہیں ہم

ہاں ابھی بیخبر لذتِ آزار ہیں ہم
مژدہ اے مشقِ ستم تازہ گرفتار ہیں ہم

ہو غمِ ہستیٔ جاوید گوارا کیوں کر
جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم

میں نے گویا صلۂ مہر و وفا بھر پایا
کاش اتنا ہی وہ کہدیں کہ جفاکار ہیں ہم

حُسنِ حیرت تو میسّر ہے تماشا نہ سہی
تیری محفل میں ہیں گو نقش بدیوار ہیں ہم

یوں تو کچھ غم سے سروکار نہ راحت کی تلاش
غم کوئی دل کے عوض دے تو خریدار ہیں ہم

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانیؔ
دو گھڑی ہوش میں آئیکے گنہگار ہیں ہم

کیا کہیں کیوں خاموش ہوئے ہیں سُن کے تری فرقت کی خبر ہم
نالۂ دل کے جتنے تھے اجزا ہو گئے سارے درہم و برہم

گو بیٹھے بھی اُٹھے بھی ہم محفلِ دشمن میں تیری خاطر
بیٹھ گئے دلِ زار کی صورت اُٹھے صورتِ دردِ جگر ہم

شکوۂ جورِ بُتاں ہم کرتے ظاہر دردِ نہاں ہم کرتے
مانا آہ و فغاں ہم کرتے لاتے کہاں سے تجکو اثر ہم

کوئی گھڑی اے بیخودیٔ غم دم لینے دے سنبھلنے دے
آ کوئی دم اے ہوش کہ تجھ سے پوچھیں گے کچھ اپنی خبر ہم

دوست تسلّی دینے آئے لے کے دوائیں چارہ گر آیا
لیجیے آئی زخمِ جگر پر اور اک تازہ آفت مرہم

ڈوب ہی جائے کشتیٔ ہستی کچھ تو ہو آخر ورنہ کہاں تک
بحرِ تلاطم خیز جہاں میں یوں ہی رہیں گے زیر و زبر ہم

گھڑیاں اپنی عمر کی ہم نے غنچوں میں چل پھر کے گزاریں
آئے تھے فانیؔ باغِ جہاں میں گویا مثلِ نسیمِ سحر ہم

زندگی کا ہے امتحاں انجام
حذر اے آہِ الاماں انجام

تیرے گھر کی زمیں ارے توبہ
ذرّہ ذرّہ ہے آسماں انجام

حُسن ہے جاودانِ بے آغاز
عشق آغازِ جاوداں انجام

طبعِ نازک پہ بار اک اک حرف
حالِ دل حرفِ داستاں انجام

اور جو مل جائے دل سے دل بیار
ایک دل کا ہے دو جہاں انجام

کم نہ تھی عمر ایک نظر کیلئے
عشق تھا مرگِ ناگہاں انجام

پوچھتے ہو نشانِ فانی کیا
وہ ہے اک قبرِ بے نشاں انجام

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

ہوا نہ رازِ رضا فاش وہ تو یہ کہیے
مرے نصیب میں تھی ورنہ سعیٔ نامعلوم

دُعا تو خیر دُعا سے اُمیدِ خیر بھی ہے
یہ مدّعا ہے تو انجام مدّعا معلوم

ردیف (ن)

لاؤ کچھ تکملۂ شوق کا ساماں کرلیں
دلِ بے تاب کو بھی دیدۂ حیراں کرلیں

ہر نفس وقفِ خیالِ رُخِ جاناں کرلیں
زندگی ہجر میں دشوار ہے آساں کرلیں

دادِ مظلوم نگاہی بھی تو لے لینے دے
ٹھہر اے موت کہ قاتل کو پشیماں کرلیں

مری آنکھوں سے بہنا چاہیے دل کا لہو برسوں
رہی ہے اُن کو خونِ آرزو کی آرزو برسوں
جئے جانے کی تہمت کس سے اُٹھتی کس طرح اُٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں
نگاہوں نے دلوں میں دل نے آنکھوں میں تجھے ڈھونڈا
تری دُھن میں رہے سودائیانِ جستجو برسوں
نقابِ جلوہ کی کایا پلٹ دی شوقِ سجدہ نے
مری وحشت نے توڑا ہے طلسمِ رنگ بُو برسوں
تری ایذا پسندی کی ادا بھی کیا قیامت ہے
مجھے مرنے نہ دے گی آرزوئے مرگ تو برسوں
ہماری بے کسی کی موت بدلہ تھا اسیری کا
رہا طوقِ اسیری بھی گرفتارِ گلو برسوں
کیے جائیں گے دل کے خانہ پر شکر کے سجدے
وفاؤں نے کیا ہے خونِ حسرت سے وضو برسوں

نہ چھیڑ اے نامرادی خستۂ اُمیدِ باطل ہوں
رہا ہے چاکِ دل آزردۂ مشقِ رفو برسوں

تجھے اور حالِ دل سے یہ تجاہل توبہ کر توبہ
کہ تجھ سے میری خاموشی نے کی ہے گفتگو برسوں

مری اک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبّت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

آور نہ جانتا ہوں فریبِ نظر کو میں
دیکھوں اُلٹ کے پردۂ داغِ جگر کو میں

ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دُھنتا ہوں سر کو میں
پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گزر کو میں

عہدِ خزاں میں رفتۂ آشوبِ ہوش ہوں
بھولا ہوا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں

گم کردہ راہ ہوں قدمِ اوّلیں کے بعد
پھر راہ بر مجھے نہ ملا راہ بر کو میں

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

مایوسِ انتظار ہوں مجنونِ اضطراب
ہنستا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

دو تین ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا
شرحِ درازِ زندگیٔ مختصر کو میں

فانیؔ دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے
یعنی ابھی تو ڈھونڈ رہا ہوں اثر کو میں

خرابِ لذّتِ دیدارِ یار ہم بھی ہیں
ترے شریکِ دلِ بیقرار ہم بھی ہیں

نہ دن کو چُپ ہیں نہ راتوں کو تیری طرح اُداس
جلے ہوئے تو چراغِ مزار ہم بھی ہیں

اُمیدِ مرگ ہے باقی تو نا اُمّید نہیں
کہ اپنی وضع کے اُمید وار ہم بھی ہیں

کسی کی بزمِ طرب میں کچھ ایک شمع نہیں
حریفِ گریۂ بے اختیار ہم بھی ہیں

ادھر بھی دیدۂ عبرت نگاہ ایک نظر
کہ عہدِ شوق کی اک یادگار ہم بھی ہیں

یہاں بھی ہے دلِ آگاہ وقفِ لذتِ درد
خرابِ مستیٔ عیشِ خمار ہم بھی ہیں

زمینِ گورِ غریباں پہ اک جگہ نہ ٹھہر
یہیں کہیں نگہِ شرمسار ہم بھی ہیں

حجابِ ہوش اٹھا اب کوئی حجاب نہیں
خیالِ یار سے اب ہم کنار ہم بھی ہیں

جنوں نے دی ہیں ہمّت وگرنہ اے فانیؔ
نشانۂ المِ روزگار ہم بھی ہیں

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں
زخمِ دل پیدا کریں یا زخمِ دل اچھا کریں

دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں
آج سے اشکِ ندامت آ تجھے دریا کریں

جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی رُوح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسمِ گل آ گیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں

جا بجا تغییرِ حالِ دل کے چرچے ہیں تو ہوں
ہم ہوئے رُسوا مگر اب ہم کسے رُسوا کریں

ہاں نہیں شرطِ مروّت حسرتِ تاثیرِ درد
رحم آ ہی جائے گا اُن سے تقاضا کیا کریں

شوقِ نظارہ سلامت ہے تو دیکھا جائے گا
اُن کو پردہ ہی اگر منظور ہے پردا کریں

ظرفِ ویرانہ بقدرِ ہمتِ وحشت نہیں
لاؤ ہر ذرّہ میں پیدا وسعتِ صحرا کریں

مرگِ بے ہنگام فانیؔ وجہِ تسکیں ہو چکی
زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں

مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں
ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

بیزار ہو نہ جائے کہیں زندگی سے دل
تاثیر سے خفا مرے نالے ہوئے تو ہیں

ہاں دردِ عشق اُن پہ کرم کی نظر رہے
صبر و قرار تیرے حوالے ہوئے تو ہیں

یہ صحبتیں بھی دیکھیے لاتی ہیں رنگ کب
مہمانِ خارِ پاؤں کے چھالے ہوئے تو ہیں

کیا جانیے کہ حشر ہو کیا صبحِ حشر کا
بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے ہیں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

فصلِ خبر بڑھا گئی عمر کے باب راز میں
یادِ وصالِ مختصر بل کے شبِ دراز میں

جلوۂ اختیار سے نسبتِ جبر ہے مجھے
شعلۂ آرمیدہ ہوں وادیٔ برقِ ناز میں

بے اثری مجھے قبول ایسے اثر کو کیا کروں
اب تو خدا اثر نہ دے آہِ اثر گداز میں

ہم نہ ازل سے آجتک سجدہ سے سر اٹھا سکے
چھپ رہے ہیں جلوہ ہائے دوست کعبے کے حریمِ ناز میں

حشر میں حشر چاہیے حشر پہ حشر چاہیے
دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیۂ نیاز میں

چشم بریدہ بار ہوں منتظرِ فشار ہوں
سبزۂ رہگذار ہوں عالمِ عرضِ ناز میں

چارۂ تپ فراق کا شکر نہیں تو کچھ نہیں
بوئے مزاجِ یار ہے نبضِ بہانہ باز میں

عالمِ درد کا نظام آ کے ذرا الٹ نہ دو
عشق سے فرق آگیا حسن کے امتیاز میں

زہر ہے یاد وائے دل یہ ہیں کہ موت ہے قریب
رعشہ مری نظر میں ہے یا کفِ چارہ ساز میں

فانیٔ زار کا ہوا خیر سے خاتمہ بخیر
عمر تمام ہو گئی عشق کے سوز و ساز میں

فرقت میں تارِ اشک ہے ہر تارِ آستیں
ہر داغِ خوں سے ہے دیدہ خونبارِ آستیں

رکھ پنجۂ جنوں سے سرکارِ آستیں
کب تک رہیں گے ہاتھ گرانبارِ آستیں

کل تک جو ہاتھ چشم و چراغِ جنوں رہا
ہے آج فرطِ ضعف سے آزارِ آستیں

انبار آنسوؤں کے ہیں خونِ جگر کے ڈھیر
معمور ہے خزانۂ سرکارِ آستیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

بے ادب گریۂ محرومیٔ دیدار نہیں
ورنہ کچھ در کے سوا حاصلِ دیوار نہیں

آسماں بھی ترے کوچہ کی زمیں ہے لیکن
وہ زمیں جس پہ ترا سایۂ دیوار نہیں

ہائے دُنیا وہ تری سُرمہ تقاضا آنکھیں
کیا مری خاک کا ذرّہ کوئی بیکار نہیں

جو تابِ دلنوازیٔ درماں نہ لا سکے
میں ہوں وہ دردِ غم کدۂ روزگار میں

ہے عکسِ روئے دوست پہ اک پرتوِ مجاز
میری نظر بھی کھنچ گئی تصویرِ یار میں

دعویٰ یہ ہے کہ دُوریٔ معشوق ہے محال
مطلب یہ ہے کہ قرب نہیں اختیار میں

قربان اک ادائے تغافل پہ لاکھ بار
وہ زندگی جو صرف ہوئی انتظار میں

ردیف (و)

مآلِ سوزِ غمِ ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

چلے آؤ کہ وہ ہے قبرِ فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

ابھی کیا ہے کسی دن خوں رُلا دے گی یہ خاموشی
زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حُسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دُنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

اُدھر مُنہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو
مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

بہارِ زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے
کسی کا عیشِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میّت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

اب آنکھ اُٹھتی ہے وہ جنبش ہوئی ہلکی سی مژگاں کو
وہ چھیڑ اچاہتے ہیں نوکِ نشتر سے رگِ جاں کو

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو
گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

مرے تلوؤں سے کانٹوں پر نئی گلکاریاں ہونگی
مری وحشت مبارک ہو جنونِ عیش ساماں کو

بیاباں کو یہاں لے آئے تھے کچھ خاک کے ذرّے
یہی ذرّے اُڑا لے جائیں گے اک دن بیاباں کو

نہ آیا موسمِ گل جب دلِ دیوانہ جیتا تھا
جو اَب آئے تو یارب آگ لگ جائے گلستاں کو

چھُٹے جب قیدِ ہستی سے تو آئے کنجِ تربت میں
رہا ہوتے ہیں ہم یعنی بدل دیتے ہیں زنداں کو

خدا غارت کرے دل کو بڑی مشکل میں ڈالا ہے
نہ سمجھا عمر بھر ناداں فریبِ عشقِ آساں کو

نظر سے جب ملی اُن کی نظر دل میں اُتر آئی
ہم آنکھوں سے لگا کر دل میں رکھ لیتے ہیں پیکاں کو

دلِ فانی سے گو نکلی مگر آساں نہیں نکلی
عجب شے تھی خدا بخشے امیدِ وصلِ جاناں کو

اثر پابندِ بیتابی نہیں تو ضبط بھی کیوں ہو
بلا سے حالِ دل کچھ بھی سہی ناگفتنی کیوں ہو

خدا رکھے محبّت کو نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
اجل کہتے ہیں جس کو وہ ہماری زندگی کیوں ہو

ستم کا لطف بھی ہے امتیازِ لطف کے دم تک
کرم بھی کیوں نہ ہو بیداد گر بیداد ہی کیوں ہو

ٹھکانا ہے سرِ تقدیر پہ ہر خونِ ناحق کا
تری تلوار میرے خون میں ڈوبی ہوئی کیوں ہو

نگاہِ یاس کو رودادِ حسرت کہہ تو لینے دے
ترے دل کو لگے ظالم وہی دل کی لگی کیوں ہو

ہماری بیخودی منجملۂ آدابِ اُلفت ہے
کسی کو دیکھ کر دل رُوشناسِ آگہی کیوں ہو

کسی کی یاد بھی لپٹی ہوئی ہے دامنِ دل سے
مری میّت پہ فانیؔ نوحہ گر اک بیکسی کیوں ہو

ردیف (ھ)

تو جانِ مدعائے دل اور دل جگہ جگہ
ہے ایک شمع رونقِ محفل جگہ جگہ

حسرت جدا امید جدا آرزو جدا
دُنیائے دل میں ہیں ترے بسمل جگہ جگہ

مٹ کر بھی داغ شاہدِ خونِ شہید ہے
دھویا ہوا ہے دامنِ قاتل جگہ جگہ

تو نے فراقِ دل ہمیں دیوانہ کر دیا
پھرتے ہیں پوچھتے خبرِ دل جگہ جگہ

رو رو کے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوں میں
ہنستی ہے مجھ پہ دُوریِ منزل جگہ جگہ

غم اصل کائنات ہے دل جوہر حیات
دل غم سے غم ہے دل سے مقابل جگہ جگہ

غربت میں سنگِ راہ کچھ آسانیاں بھی تھیں
کھاتی ہے ٹھوکریں مری مشکل جگہ جگہ

کیا پوچھتا ہے وعدہ شکن کیا ہیں داغِ دل
اُبھرے ہیں نقشِ وعدۂ باطل جگہ جگہ

اک سرگزشتِ درد ہے ہر ذرہ خاک کا
پہنچی ہے داستانِ غمِ دل جگہ جگہ

اب یادگارِ فانیِ بسمل ہے اس قدر
گلگوں ہے خاکِ کوچۂ قاتل جگہ جگہ

ردیف ی

نہیں کہ وحشتِ دل چارہ گر نہیں ہے مجھے
جنونِ چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے

خرابِ لذّتِ جانکاہیٔ محبّت ہوں
مآلِ عشق سے قطعِ نظر نہیں ہے مجھے

نہیں یہ مردنِ دشوار بے سبب یعنی
یقینِ مژدۂ پیغام بر نہیں ہے مجھے

جنوں بھی اثرِ بے خودیٔ غم نہ سہی
تمہیں خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں ہے مجھے

نہ بارِ منّتِ ناخن نہ خطرۂ سوزن
مجالِ بخیۂ زخمِ جگر نہیں ہے مجھے

یہ کیا ہے پھر کہ مجھے اک جہاں نظر آیا
خمارِ بادۂ وحدت اگر نہیں ہے مجھے

یہ جستجو ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں
تلاشِ چشمِ حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

ہلاکِ تلخیٔ تاثیرِ شکوہ ہوں فانی
شکایتِ گلۂ بے اثر نہیں ہے مجھے

مشتاق خبردار رہیں دل سے جگر سے — ملتی ہے زمانے کی نظر اُن کی نظر سے

منہ ڈھانپ لیا جوشِ ندامت کے اثر سے — خورشیدِ قیامت نے مرے دامنِ تر سے

یہ سایہ بھی اُٹھا مری اُمید کے سر سے — مُنہ موڑ لیا آہ نے دُنیائے اثر سے

دل جس سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں — ملنے کو تو ملتی ہے نظر اُن کی نظر سے

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانکے — سینہ میں دھواں خیر سے اُٹھتا ہے نظر سے

اُمیدِ اثر اور ان آہوں کو جو نکلیں — اللہ کا گھر ڈھونڈ کے اللہ کے گھر سے

کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزمِ نوازش — لبیک کی آتی ہے صدا چاکِ جگر سے

عرفانِ محبت سے جدا دل نہیں ہوتا — لیتے ہیں یہاں فالِ خبر ذوقِ خبر سے

بیکاری وحشت میں ہم اے گریۂ وحشت — دیوار کی صورت کو ملا لیتے ہیں در سے

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی
روتی ہے گلے مل کے سحر شمعِ سحر سے

عیشِ جہاں باعثِ نشاط نہیں ہے
خندۂ تصویر انبساط نہیں ہے
گریہ کے آداب کے حواس ہیں کس کو
ہائے کہ اب تابِ احتیاط نہیں ہے
رُوح کو کیوں تن سے اختلاط ہے باقی
دہر میں اب رسمِ اختلاط نہیں ہے
طاقتِ دل دے چکی جواب پر اب تک
قوّتِ غم رُو بہ انحطاط نہیں ہے
اُن کی جفائیں بھی اب وفا کا نہیں رنگ
غیر سے بھی اب وہ ارتباط نہیں ہے
داغ باندازۂ جگر نہیں فانیؔ
نقش بہ اندازۂ بساط نہیں ہے

ہوش رہے نہ دوش کا فکرِ مآل رہ نہ جائے
خلوتِ یادِ یار میں کوئی خیال رہ نہ جائے

عشق ہے جب جنوں تو پھر شاد ہو اے دلِ حزیں
کوئی گلہ اٹھا نہ رکھ کوئی سوال رہ نہ جائے

وعدہ فریب ہی سہی تند ہو اے ہوسِ شوق
ہاں رہِ انتظار میں گردِ ملال رہ نہ جائے

تابِ نظارہ جلال حشر میں بخش کر مجھے
شانِ جمال بھی دکھا شانِ جمال رہ نہ جائے

عجز اِدھر اُدھر غرور دونوں غیور سے غیور
دامنِ مدعا سے دُور دستِ سوال رہ نہ جائے

اب جو ہوا ہوا مآل چھوڑ خدا پہ اندمال
زخمِ جگر پہ خاک ڈال تیر سنبھال رہ نہ جائے

جبرِ قبولِ عام کر کارِ فغاں تمام کر
غیرتِ غم کو رام کر اُف کی مجال رہ نہ جائے

نزع میں دادِ آہ دے اب نہ حیا کو راہ دے
عہدِ کرم نباہ دے پرسشِ حال رہ نہ جائے

فانیِ زار جاں بری عشق میں مصلحت نہیں
جانِ وداعِ دل کے بعد ہو کے وبال رہ نہ جائے

رہ جائے یا بلا سے یہ جان رہ نہ جائے
تیرا تو اے ستم گر ارمان رہ نہ جائے

جو دل کی حسرتیں ہیں سب دل میں ہوں تو بہتر
اس گھر سے کوئی باہر مہمان رہ نہ جائے

اے سوزِ غم جلا دے اے دردِ خوں رُلا دے
کچھ ان کی دل لگی کا سامان رہ نہ جائے

سب منزلیں ہوئیں طے محشر ہے اور اے دل
یہ ایک رہ گیا ہے میدان ہیں رہ نہ جائے

وہ جام کفر پرور بھر دے کہ مست کر دے
مستوں کے دل میں ساقی ایمان رہ نہ جائے

آ کر پلٹ نہ خالی اے مرگ جان لے جا
فانی کے سر پہ تیرا احسان رہ نہ جائے

ہر تصوّر جلوۂ صورت کا کفر انگیز ہے
خاکِ دل اللہ اکبر کیا ہی کافر خیز ہے

بھر کے ساقی ایک جامِ زہر مے آلود لا
یعنی خاکِ غم دردہن آج آتشِ دل تیز ہے

ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا ممکن نہیں
عالم ایک مجموعۂ ذرّاتِ صحرا بیز ہے

تھی شکستِ دل مگر نالۂ آوازِ شکست
ٹوٹ کر بھی دل طلسمِ شوق یاس آمیز ہے

ہے فنا آبادِ غم اک معنیٔ لفظ آفریں
صورت آبادِ جہاں اک لفظِ معنی خیز ہے

شاید آ پہنچی ہے غم کی منزلِ آخر قریب
رخشِ ہستی کو جواب ہر سانس اک مہمیز ہے

جلوہ کیا دیکھے کوئی قدرت ہی فرصت کہاں
یاں نقابِ جلوہ خود حسنِ تماشا ریز ہے

گو نہیں جز ترکِ حسرت دردِ ہستی کا علاج
آہ وہ بیمار جو آزردۂ پرہیز ہے

مایۂ ادراکِ ہستی ہوں تکلّف برطرف
زندگی میری دروغِ مصلحت آمیز ہے

مرگِ فانی کو ہے یا رب آہ کا اب انتظار
دیر سے پیمانۂ عمرِ وفا لبریز ہے

گردش وہی یہاں بھی سپہرِ کہن میں تھی
غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی

آزردہ کیوں ہے مجھ سے مری آشفتگی سے تم
آخر یہی تو زلف شکن در شکن میں تھی

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے
میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

بے پردہ ذکرِ یار ہے در پردہ یادِ یار
میری زباں پہ ہے جو دلِ برہمن میں تھی

بعدِ فنا بھی کم نہ ہوئیں بے قراریاں
لاشہ نہ تھا مرا کوئی بجلی کفن میں تھی

وہ گل ہے گل جسے تری خلوت میں بار تھا
وہ شمع شمع ہے جو تری انجمن میں تھی

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں بھی تھی

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

اے یاس تو نے آ کے اُسے بھی مٹا دیا
لذت سی کچھ جو شکوۂ رنج و محن میں تھی

لو آج مرگِ فانیٔ بےکس سے مٹ گئی
وہ اک خلش جو خاطرِ اہلِ وطن میں تھی

ہم اپنے جی سے گزرے یوں سحر کی — شبِ غم بڑھ چلی تھی مختصر کی
تمہیں کس دل سے اپنی جان کہیے — وفا اُس نے تو کی اور عمر بھر کی
انہیں بےچین کرنا چاہتا ہے — قضا آئی ہے کیا دردِ جگر کی
کشش کیسی کہاں کا جذبۂ دل — وہ آئے ہیں بن آئی ہے اثر کی
ہم اکثر جا کے ویرانے سے پلٹے — ہمارے گھر سے ویرانی نہ سر کی
مرا قتل اُن کے ہاتھوں یہ تو باتیں — کچھ اُن کے منہ کی ہیں کچھ نامہ بر کی
تمہارے عشق کا اللہ رے فیض — جگر میں دھوم ہے دردِ جگر کی
نگاہِ شوق کے دم تک تھیں آنکھیں — اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی
اُٹھا ہاتھ اے تصوّر فاتحہ کو — یہ دل کی ہے نظر یا ہے جگر کی

شبِ فرقت کٹی یا عمرِ فانی
اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی

کم ہے یا بڑھ گئی وحشت ترے دیوانوں کی
دامنوں کی ہے خراب نہ گریبانوں کی

فصلِ گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی
دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی

دل کے تیور تو بجھے یاس کے چھینٹوں سے مگر
نہ بجھی آگ لگائی ہوئی ارمانوں کی،

حسن مجبورِ تغافل ہے ادب شرطِ وفا
رہ گئی شرم غمِ عشق کے افسانوں کی

چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

طوقِ منت کے بڑھا ہو گئی منت پوری
بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں کی

اب جفا ہے نہ وفا یادِ وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

دل میں رگ رگ سے کھنچ آئی ہیں لہو کی بوندیں
دعوتیں سینۂ فانیؔ میں ہیں پیکانوں کی

مانا حجابِ دید مری بے خودی ہوئی — تم وجہِ بیخودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی

دل ہے وہ طاق غم کدۂ عمرِ دوش کا — رکھی ہے جس پہ شمعِ تمنا بجھی ہوئی

میں منزلِ فنا کا نشانِ شکستہ ہوں — تصویرِ گردِ بادِ وفا ہوں مٹی ہوئی

تعمیرِ دل نے تجھ سے لیا انتقامِ عشق — تیری ہی بزم جلوہ گہِ عاشقی ہوئی

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت — یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

مرحوم کس ادا کے تماشائیوں میں تھا — پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی

دُنیائے دل میں یاس کی اللہ رے دار و گیر — جو آرزو کہ خلق ہوئی کُشتنی ہوئی

کیجے دُعا کہ اُف نہ کرے دردمندِ عشق — اوّل تو دل کی چوٹ پھر اتنی دُکھی ہوئی

میرا وجود کفر مری زندگی گناہ — ہستی کو ہوش ہوش کو لازم خودی ہوئی

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں — آواز آ رہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی

لازم ہے اختیاط ندامت نہیں ضرور — لے اب چھری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

فانیؔ وہ میں ہوں نقطۂ موہومِ اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہیں ملی ہوئی

چمکا دیا ہے رنگِ چمن لالہ زار نے
شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے

ہر شام شامِ گور ہے ہر صبح صبحِ حشر
کیا دن دکھائے گردشِ لیل و نہار نے

تربت کے پھول شام سے مرجھا کے رہ گئے
رو رو کے صبح کی مری شمعِ مزار نے

ہاں ہم نہ تھے فریبِ تمنا سے بے خبر
کیا کہیئے کیا کیا دلِ اُمیدوار نے

اپنی تو ساری عمر ہی فانیؔ گذار دی
اک مرگِ ناگہاں کے غمِ انتظار نے

بشر میں عکسِ موجوداتِ عالم ہم نے دیکھا ہے
وہ دریا ہے یہ قطرہ لیکن اس قطرہ میں دریا ہے

مری میّت پہ اُن کا طرزِ ماتم کس بلا کا ہے
دلِ بے مدّعا سے پوچھتے ہیں مدّعا کیا ہے

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہ جائے تو دریا ہے

کوئی دل میں نہیں آیا تو پھر یہ داغِ دل کیا ہے
بتا اے عشق یہ کس چور کا نقشِ کفِ پا ہے

میری محرومیوں کا فیض جاری ہے رگ و پے میں
بدن میں جو لہو کی بوند ہے خونِ تمنا ہے

غبارِ رشکِ خارستانِ حسرت یاس کے منظر
ہمارے دل کی دُنیا بھی کوئی دُنیا میں دُنیا ہے

تمہارے ظلم، طعنے غیر کے، لوگوں کے آوازے
محبت میں دلِ مجبور کو سب کچھ گوارا ہے

نظر آتے ہیں دل میں آج پھر آثارِ بیتابی
ہم اے اُمید سمجھے اس میں کچھ تیرا اشارا ہے

محبت ہی نہیں تو پاسِ آدابِ محبت کیا
وفا کی یا جفا کی جانے دو یہ ذکر ہی کیا ہے

اُسی کو تم نگاہِ اہلِ دُنیا جان کہتے ہو
وہ کانٹا جو مری رگ رگ میں رہ رہ کر کھٹکتا ہے

نہ بن انجان ظالم لاکھ بے تاثیر ہوں نالے
خبر دل کو نہ ہو دل کی کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

شبِ فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہے مزاجِ دل تو اچھا ہے

یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

کیا ہوا باندھی ہے صدقے نالۂ شب گیر کے
آسماں پر اُکھڑے جاتے ہیں قدم تاثیر کے

بے مروّت بن کے اب کیا سوئے صحرا جائیے
لوٹتے ہیں پاؤں پر حلقے مری زنجیر کے

ضبط باقی غم سلامت ہے تو سُن لینا کبھی
آہ گھبرا کر نکل آئی کلیجہ چیر کے

وصل سے محروم ہوں میں ورنہ گستاخی معاف
بوسے لیتا ہے تصوّر آپ کی تصویر کے

مجکو مضطر دیکھ کر کہتا ہے قاتل پیار سے
آ ادھر سائے میں سو جا دامنِ شمشیر کے

ساتھ جائے گا مری میّت کے سامانِ خلش
دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکاں میں نے تیرے تیر کے

میرے مرتے ہی دل بیتاب کو چین آ گیا
زندگی صدقے میں اُتری گردشِ تقدیر کے

سعیٔ درماں بے اثر فکرِ دوا بے فائدہ
زخمِ دل اے چارہ گر قابل نہیں تدبیر کے

یاس کے آتے ہی ارماں دل سے یہ کہہ کر چلے
ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

دیکھئے کیا ہو وہ اور آزردگی بے سبب
ہم خطا ناکردہ خوگر عذرِ بے تقصیر کے

دیکھ فانیؔ وہ تری تدبیر کی میّت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آتے ہی تیرے وعدۂ فردا کا اعتبار
گھبرا کے مر نہ جائے تو پھر کیا کرے کوئی

وہ جلوہ بے حجاب سہی ضد کا کیا علاج
جب دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی

کہتے ہیں حسن ہی کی امانت ہے دردِ عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

خالی ہے بزمِ شوق طلب اہلِ ہوش سے
اتنا نہیں کہ تیری تمنّا کرے کوئی

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو
اس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

فانیؔ دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور
غافل نہیں کہ اُن سے تقاضا کرے کوئی

ابتدائے عشق ہے لطفِ شباب آنے کو ہے
صبر رخصت ہو رہا ہے اضطراب آنے کو ہے

قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنیکو ہے
آفتابِ صبحِ محشر ہم رکاب آنے کو ہے

مجھ تک اُس محفل میں پھر جامِ شراب آنیکو ہے
عمرِ رفتہ پلٹی آتی ہے شباب آنے کو ہے

ہائے کیسی کشمکش ہے یاس بھی ہے آس بھی
دم نکل جانے کو ہے خط کا جواب آنے کو ہے

نا اُمیدی موت سے کہتی ہے اپنا کام کر
آس کہتی ہے ٹھہر خط کا جواب آنے کو ہے

بھر کے ساقی جامِ مے اک اور لا اور جلد لا
ان نشیلی انکھڑیوں میں پھر حجاب آنیکو ہے

خانۂ تصویر میں آنے کو ہے تصویرِ یار
آئینہ میں قدِ آدم آفتاب آنے کو ہے

اب کے سوئے کیا اُٹھیں گے فتنۂ محشر سے ہم
صبحِ محشر کے قریب آنکھوں میں خواب آنیکو ہے

دیکھئے موت آئے فانی یا کوئی فتنہ اٹھے
میرے قابو میں دلِ بے صبر و تاب آنیکو ہے

یہ ہستئ دو روزہ گویا کہ نہیں فانی
اللہ رے ترا اے دل اندازِ پریشانی

تعبیرِ اجل نے دی اس خوابِ پریشاں کی
ہم مر کے تجھے سمجھے اے ہستئ انسانی

کیونکر میں کہوں تم نے آئینہ نہیں دیکھا
بیوجہ نہیں ہرگز آئینہ کو حیرانی

سُن میری خموشی سے افسانۂ غم میرا
دزدیدہ نگاہی سے کر پرسشِ پنہانی

کیا ہم شبِ وصل ان سے فرقت کا گلہ کرتے
تھی رات بہت تھوڑی اور بات تھی طولانی

یاں میرے قدم سے ہے ویرانے کی آبادی
واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے ویرانی

پھر خواب میں طوق آیا زنجیر نظر آئی
درپردہ ہے وحشت کی پھر سلسلہ جنبانی

مانا کہ غمِ جاناں غارت گرِ ساماں ہے
رکھا ہی یہاں کیا ہے جز بے سر و سامانی

مشکل مرے مرنے کی مشکل ہے کہ آساں ہو
کچھ ناز کی قاتل کچھ اپنی گراں جانی

فانی وہ بلاکش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غمِ راحت کی صورت بھی نہ پہچانی

متاعِ جلوۂ تحیّر ہے مجکو سکتا ہے
دل آئینہ ہے کہ مُنہ آئینہ کا تکتا ہے

حجابِ زعمِ تماشا اُٹھا تو کچھ دیکھوں
رہی نگاہ یہ پردہ تو اُٹھ بھی سکتا ہے

وہ دل میں ہوک سی اُٹھی وہ مجکو ہوش آیا
وہ درد جس کی دوا تو ہے پھر چمکتا ہے

اُمید و بیم پہ ہے ہستیٔ بشر موقوف
کہ جا کے دم پلٹ آتا ہے دل دھڑکتا ہے

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

اجل بس ایک ہی کانٹا نکال کر چل دے
ٹھہر کہ خارِ تمنا ابھی کھٹکتا ہے

حدودِ غم سے غمِ عشق بڑھ چلا فانی
وہ جامِ عمر کہ لبریز تھا چھلکتا ہے

عشق نے دل میں جگہ کی تو قضا بھی آئی
دردِ دنیا میں جب آیا تو دوا بھی آئی

دل کی ہستی سے کیا عشق نے آگاہ مجھے
دل جب آیا تو دھڑکنے کی صدا بھی آئی

صدقے اُتریں گے اسیرانِ قفس چھوٹے ہیں
بجلیاں لے کے نشیمن پہ گھٹا بھی آئی

ہاں نہ تھا بابِ اثر بند مگر کیا کہیئے
آہ پہنچی تھی کہ دشمن کی دعا بھی آئی

آپ سوچا ہی کئے اُس سے ملوں یا نہ ملوں
موت مشتاق کو مٹی میں ملا بھی آئی

لو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا
آج بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

دیکھ یہ جادۂ ہستی ہے سنبھل کر فانی
پیچھے پیچھے وہ دبے پاؤں قضا بھی آئی

مر کر مریضِ غم کی وہ حالت نہیں رہی
یعنی وہ اضطراب کی صورت نہیں رہی

ہر لمحۂ حیات رہا وقفِ کارِ شوق
مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

اک نالۂ خموشِ مسلسل ہے اور ہم
یادش بخیر ضبط کی طاقت نہیں رہی

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانہ کا ذکر کیا
اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

وہ عہدِ دلفریبیٔ تاثیر اب کہاں
مدت سے آہ آہ کی حسرت نہیں رہی

اُن کے تو دل سے نقشِ کدورت بھی مٹ گیا
ہم شاد ہیں کہ دل میں کدورت نہیں رہی

دل اور ہوائے سلسلہ جنبانیٔ نشاط
کیوں پاسِ وضعِ غم تجھے غیرت نہیں رہی

اے دردِ عشق اب تو خدا کے لئے نہ چھیڑ
دل میں کراہنے کی بھی طاقت نہیں رہی

ہر بے گنہ سے وعدۂ بخشش ہے روزِ حشر
گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی

اے عرضِ شوق مژدہ کہ دل چاک ہو گیا
تکلیفِ پردہ داریٔ حسرت نہیں رہی

پتھرا گئی تھی آنکھ مگر بند تو نہ تھی
اب یہ بھی انتظار کی صورت نہیں رہی

عبرت نے بے کسی کا نشاں بھی مٹا دیا
اُڑتی تھی جس پہ خاک وہ تربت نہیں رہی

محشر میں بھی وہ عہدِ وفا سے مکر گئے
جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

کس منہ سے غم کے ضبط کا دعویٰ کرے کوئی
طاقت بقدرِ حسرتِ راحت نہیں رہی

فانی امیدِ مرگ نے بھی دے دیا جواب
جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی

اب لب پہ وہ ہنگامۂ فریاد نہیں ہے
اللہ رے تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے

آتی ہے صبا سوئے لحد اُن کی گلی سے
شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے

اللہ بچائے اثرِ ضبط سے اُن کو،
بیداد تو ہے شکوۂ بیداد نہیں ہے

آمادۂ فریاد رسی ہے وہ ستمگر
فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں ہے

دُنیا میں دیارِ دلِ فانیؔ کے سوا ہائے
کوئی بھی وہ بستی ہے جو آباد نہیں ہے

مانا کہ بات وعدۂ فردا پہ ٹل گئی
اور بیوفا جو کل بھی نہ یہ آج کل گئی

اس خانۂ خراب کی بربادیاں نہ پوچھ
یادش بخیر آہ بھی دل سے نکل گئی

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانے میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

کچھ کہہ کے چارہ ساز نے تسکین دی تو ہے
سنتا تو ہوں کہ اب مری حالت سنبھل گئی

آتی ہے خاکِ جادۂ ہستی سے بوئے دل
کس آرزو بھرے کی تمنا کچل گئی

دل کیوں شبِ فراق تڑپ کر ٹھہر گیا
کیوں اضطراب کیا تری صورت بدل گئی

تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

اللہ رے نوکِ نشترِ غم کی لگاوٹیں
اک اک لہو کی بوند پہ ظالم مچل گئی

فانی کے دل سے آیۂ لاتقنطو کے بعد زاہد وہ دل فریبیِ حسنِ عمل گئی

اُمّیدِ التفات کو رُسوا نہ کیجیے
لازم نہیں کہ خونِ تمنّا نہ کیجیے

شرمندہ وہمِ رشک سے اتنا نہ کیجیے
آئینہ دیکھ کر مجھے دیکھا نہ کیجیے

اندیشہ عیشِ خوابِ لحد کا نہ کیجیے
ہنگامِ نزع وعدۂ فردا نہ کیجیے

دیکھو جو وقتِ پرسشِ جاناں نہ بھول جائیں
ٹھانی تو ہے کہ عرضِ تمنّا نہ کیجیے

سرکار پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں
یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھّا نہ کیجیے

کیا فرض تھی نگاہِ مکرّر ازل کے بعد
یہ جان ہے، یہ دل ہے، تقاضا نہ کیجیے

فانیؔ بلائے مرگ سے غم کیجیے غلط
اب جستجوئے راحتِ دُنیا نہ کیجیے

کارواں گذرا کیا ہم رہ گذر دیکھا کیے
ہر قدم پر نقشِ پائے راہ بر دیکھا کیے

ترکِ بیداد آہ اک تمہید تھی بیداد کی
دل جلا کر میرے نالوں کا اثر دیکھا کیے

دردمندانِ وفا کی ہائے رے مجبوریاں
دردِ دل دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کیے

یاس جب چھائی اُمیدیں ہاتھ مل کر رہ گئیں
دل کی نبضیں چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کیے

رُخ مری جانب نگاہِ لطف دشمن کی طرف
یوں اُدھر دیکھا کیے گویا اِدھر دیکھا کیے

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کیے

زیست تھی فانی بقدرِ فرصتِ تمہیدِ شوق
عمر بھر ہم یہ تغیرِ نورِ بشر دیکھا کیے

ذرّہ ذرّہ تربتِ فانیؔ کا شیون جوش ہے
اس صفِ ماتم میں اک شمعِ لحد خاموش ہے

پھیرلے میّت کی جانب سے نگاہِ التفات
سینکڑوں شکووں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے

وصل ہو یا ہجر دونوں ہیں مرے مشرب میں کفر
شوقِ وحدت آشنا بیگانۂ آغوش ہے

طور تو ہے ربِّ ارنی کہنے والا چاہیئے
لن ترانی ہے مگر نا آشنائے گوش ہے

اک طلسمِ فیض ہے سینہ میں سوزِ دل کی ذات
بے تکلف ہر نفس اک شعلۂ خس پوش ہے

رازِ آزادی فقط تیرے اسیروں پر کھلا
جو ترے قدموں پہ سر ہے بے نیازِ دوش ہے

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہیئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

مجھے قسم ہے ترے صبر آزمانے کی
کہ دل کو اب نہیں برداشت غم اٹھانے کی

ترا اسیر ہوں چاہے تو ذبح کر صیّاد
نہ توڑ دل کہ امانت ہے آشیانے کی

خیالِ یار ہے اک حسن و عشق کی دُنیا
مری نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی

زبانِ حال ٹھہر داستانِ عشق نہ چھیڑ
کہ خوابِ مرگ ہے تاثیر اس فسانے کی

گلہ ضرور نہیں حالِ بیخودی معلوم
تمہاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی

نہ دل کے ظرف کو دیکھو نہ طور کو دیکھو
بلا کی دُھن ہے تمہیں بجلیاں گرانے کی

نہ سانس کا ہے بھروسہ نہ آہ میں تاثیر
وہ کیا پھرے کہ ہوا پھر گئی زمانے کی

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے
ادا وہ یاد ہے گھرا کے روٹھ جانے کی

جبینِ ورد ہے بیتابِ سجدہ آفاقیؔ
کدھر ہے خاک ترے قدر کے آستانے کی

ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دُولہن بنائے ہوئے

الٰہی کیوں نہیں ہوتی کوئی بلا نازل
اثر ہے دیر سے دستِ دُعا اٹھائے ہوئے

تری لگائی ہوئی آگ حشر تک نہ بجھی
ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے ترے جلائے ہوئے

بلائے جاں ہے مگر پھر بھی آرزو ہے تری
ہم اس کو اپنے کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے

سحر ہوئی کہ وہ یادش بخیر آتا ہے
چراغ ہیں مری تربت کے جھلملائے ہوئے

تمہیں کہو تمہیں اپنا سمجھ کے کیا پایا
مگر یہی کہ جو اپنے تھے سب پرائے ہوئے

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا
نظر بچائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے

اجل کو مژدۂ فرصت کہ آج فانیٔ زار
امیدِ وصل سے بیٹھا ہے لو لگائے ہوئے

رابطۂ جسم و جاں دیکھئے کب تک رہے
زیست کا ہم پر گماں دیکھئے کب تک رہے

میری گراں جانیاں مجھ سے جدا ہوں نہ ہوں
سعیٔ الم رائگاں دیکھئے کب تک رہے

دیکھئے کب تک مٹے سینۂ فانی کا داغ
تربتِ دل کا نشاں دیکھئے کب تک رہے

غمِ محبّت نظر آیا تو ہم انساں سمجھے
برق جب جسم سے وابستہ ہوئی جاں سمجھے

شوق کی گرمیٔ ہنگامہ کو وحشت جانا
جمع جب خاطرِ وحشت ہوئی ارماں سمجھے

حکمِ وحشت ہے کہ زنداں کو بھی صحرا جانو
دل وہ آزاد کہ صحرا کو بھی زنداں سمجھے

فانی اس عالمِ ظاہر میں سراپا غم تھا
چھپ گیا خاک میں تو ہم غمِ پنہاں سمجھے

نصیب ہو بھی تو کیا لطف وصلِ یار میں ہے
سوائے عیش سو تقدیر انتظار میں ہے

فلک نے یوں تو جو چاہا کیا ستم یہ ہے
شمارِ دل بھی ستم ہائے بے شمار میں ہے

قضا پہ اب ہے مری زندگی کا دار و مدار
سو وہ بھی اُن کی اداؤں کے اختیار میں ہے

عزیزِ خاطرِ فطرت ہے جانِ عبرت ہے
ہر ایک ذرّہ جو اس عالمِ غبار میں ہے

سرشتِ برق سُر غیر ہو خدا نہ کرے
وہ اضطراب کہ جانِ اُمیدوار میں ہے

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل
غریب کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے

حریفِ سوزِ نہاں تو نہیں مگر پھر بھی
بلا کی آگ اس آہِ شرارہ بار میں ہے

ہماری لاش مرقع ہے بے قراری کا
اک اضطراب کی صورت بھی اس قرار میں ہے

چمن سے رخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید
کچھ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

کیا کیا نہ اُس نے کام لیا اک حجاب سے
اکثر صفیں نظر کی اُلٹ دیں نقاب سے

دل کیا ہے پوچھ اپنے رُخِ بے نقاب سے
شاید نشانِ ذرّہ ملے آفتاب سے

جاتی ہے اے اُمیدؔ کہاں دل اُجاڑ کر
چل دے کوئی نہ اُٹھ کے جہانِ خراب سے

کل تک جو تم سے کہہ نہ سکا حالِ اضطراب
ملتی ہے آج اُس کی خبر اضطراب سے

یا میرے بے شمار گناہوں سے در گذر
یا میرے عذر سُن کرمِ بے حساب سے

اے آرزوئے دید وہ دن کیا ہوئے کہ دل
لبریز شکوہ تھا نگہِ کامیاب سے

فانیؔ جہانِ عشق میں ہوں لاکھ انقلاب
غم بدگماں نہیں اثرِ انقلاب سے

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدّعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبورِ خاموشی کا ہائے
وہ جنازہ پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

تو میرے دل کی نہ سن یہ آئینہ ہے اس سے پوچھ
تیرے صورت آشنا درد آشنا کیوں ہو گئے

کیا تمہیں اندازۂ ضبطِ محبت ہو گیا
چشم بد دور اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے

دل کی صورت آ کے پہلو سے تمہیں جانا نہ تھا
اور گئے بھی تھے تو جانِ بے وفا کیوں ہو گئے

کیا سنانا چاہتا ہے اے فریبِ التفات
خیر ہے اب آج مطلب آشنا کیوں ہو گئے

اور فانیؔ بڑھ گئی بیتابیٔ دل بعدِ مرگ
کیا کہیں مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے

محشر میں عذرِ قتل بھی ہے خوں بہا بھی ہے
وہ اک نگاہ جس میں گلا بھی حیا بھی ہے

اِس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے
کیوں چارہ ساز تجکو اُمیدِ شفا بھی ہے

جب عشق ابتدا ہی نہیں انتہا بھی ہے
دل میری زندگی ہی نہیں ہے قضا بھی ہے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
ایک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے

اے حدِ ضبطِ درد نہ کر دل سے اب دریغ
اک آہِ بے صدا کہ دعا بھی دوا بھی ہے

سامانِ صد نگاہ ہے ہر ذرّہ خاک کا
لیکن یہ دیکھنا ہے کوئی دیکھتا بھی ہے

ہاں دل میں درد بھی ہے زباں بھی نہیں ہے بند
کس سے کہیں کوئی دلِ درد آشنا بھی ہے

دل اور حکمِ ضبط سے یارائے انحراف
پردے میں کوئی دُشمنِ اہل وفا بھی ہے

فانیؔ سے دل کے ساتھ تقاضا ہے جان کا
ظالم اس ابتدا کی کوئی انتہا بھی ہے

غم مٹا دیا۔ غم کا لذّت آشنا کر کے
کیا کیا ستم گر نے خو گرِ جفا کر کے

کہتے ہو وفا کی بھی ایک حد معیّن تھی
کس قدر پشیماں ہوں ترکِ مدّعا کر کے

وہ مری شکایت پر چپ کھڑے ہیں محشر میں
بُت اُنھیں بنا پایا اب خدا خدا کر کے

وہ مرے جنازے پر بعدِ مرگ آئے ہیں
مدّعا ہوا حاصل ترکِ مدّعا کر کے

لذّتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی
دل ٹھہر گیا فانیؔ موت کی دُعا کر کے

جاتا ہے صبر بے سروساماں کئے ہوئے
ناموسِ عشق ہدیۂ مژگاں کئے ہوئے

افشائے رازِ اہلِ جنوں مصلحت نہیں
پھرتا ہوں دھجیوں کو گریباں کئے ہوئے

پھر لے چلا ہے گریۂ بےتاب خطِ شوق
دل کے لہو کو زینتِ عنواں کئے ہوئے

پھر ناوکِ نگاہ کا رُخ پھیر سوئے دل
سامانِ صد جراحتِ پنہاں کئے ہوئے

دل کی لحد پہ خاک اُڑانے چلا ہے عشق
ذرّہ سے اکتسابِ بیاباں کئے ہوئے

پھر گوشہ گیر حلقۂ زنجیر ہے جنوں
صحرا کو نذرِ تنگیٔ زنداں کئے ہوئے

اور اک دردِ دل بھی رہا ہر نفس کے ساتھ
دشواریٔ حیات کو آساں کئے ہوئے

طوفانِ اضطرابِ جنوں اُٹھ کہ دیر سے
بیٹھا ہوں جمع خاطرِ داماں کئے ہوئے

اے عقلِ غم فروش فراغت نما ٹھہر
آتا ہے عشق درد کو درماں کئے ہوئے

کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

فانیؔ اب اُن کی یاد پہ کیا کیجئے نثار
مدت ہوئی وداعِ دل و جاں کئے ہوئے

شکوہ کیا کیجئے نگاہِ یار خود غم دیدہ ہے
کیا تماشا ہے کہ دل کا چور بھی دزدیدہ ہے

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم
بلبلا ہے عینِ دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

مائلِ پرواز ہے مقتل میں خونِ گرمِ دل
آتشِ سیال تھا اب شعلۂ بالیدہ ہے

دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اُسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شئے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشتِ دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

اُبھری ہوئی ہے چوٹ دلِ دردمند کی
رکھنا قدم تصوّرِ جاناں سنبھال کے

کہتے ہیں جن کو عُرفِ محبّت میں داغِ دل
وہ نقش تو نہ ہوں ترے پلے خیال کے

ہنگامۂ شباب ہے اے دل ذرا ٹھہر
جاتا ہے تو کہاں مجھے آفت میں ڈال کے

قربانِ ایک آمدِ غم پہ ہزار دل
صدقے اس ابتدائے قیامت مآل کے

تو شمعِ آئینہ خانہ ہے آئینہ کیا ہے
تری خدائی کے قربان ماسوا کیا ہے

اُٹھا بھی دے نگہِ ماسوا نگہ کا حجاب
یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہے دیکھنا کیا ہے

کیا ہے خلق مجھے باوجودِ علمِ گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

سمائیں آنکھ میں کیا شعبدے قیامت کے
مری نظر میں ہیں جلوے کسی کی قامت کے

یہاں بلائے شبِ غم وہاں بہارِ شباب
کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے

ستارے ہوں تو ستارے نہ ہوں تو برقِ بلا
چراغ ہیں تو یہ ہیں بیکسوں کی تربت کے

اُلٹ دیا غمِ عشقِ مجاز نے پردہ
حجابِ حسن میں کچھ راز تھے حقیقت کے

اُڑا لئے ہیں کچھ انداز موت نے فانی
عتابِ یار کے روزِ سیاہِ فرقت کے

دیا اک جان کے دشمن کو دل جاں نذرِ دلبر کی
یہ ہے اپنی کہانی قصہ کوتہ زندگی بھر کی

الٰہی کیا خبر لاتا ہے قاصد وصل دلبر کی
بلائیں لے رہی ہیں میری تدبیریں مقدّر کی

قضا آئی، طبیب آیا، وہ آئے، دیکھ کون آیا
کسی نے اے جنوں زنجیر کھڑکائی مرے در کی

وہ شامِ وصل دشمنِ زلف سُلجھاتے ہیں رُک رُک کر
اُنہیں یاد آ گئیں کیا گتھیاں میرے مقدّر کی

اجل کی آرزو ہو دل ہیں فانی اور دُنیا ہو،
خدا رکھے یہی رونق ہے اس اُجڑے ہوئے گھر کی

ہر ستم کا یہ تقاضا ہے کہ ہو فریاد بھی
اب تو جینا ہی پڑے گا شاد بھی ناشاد بھی

گلشن تصویر میں تھے طائر تصویر ہم
کیا کہیں کیونکر رہے مجبور بھی آزاد بھی

خیر ہے کیا چاہتی ہے اے نسیم کوئے یار
اب تو ظالم میری مٹی ہو چکی برباد بھی

اجل جو آئے تو اپنا بھی کام ہو جائے
تمام عمر کا قصہ تمام ہو جائے

نگاہ ناز کا صدقہ نیاز مند ہیں ہم
کبھی قبول ہمارا سلام ہو جائے

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے
یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

تری خدائی میں ہوتی ہے روز شام و سحر
الٰہی اپنی سحر کی بھی شام ہو جائے

کی وفا یار سے ایک ایک جفا کے بدلے
ہم نے گن گن کے لیے خونِ وفا کے بدلے

کی سپردِ درِ میخانہ اجل نے مری خاک
کس کو سونپا مجھے ظالم نے خدا کے بدلے

لطف، بیداد، حیا، غصہ، تغافل، شوخی
رنگ کیا کیا نہ تلوّن نے ادا کے بدلے

ہائے میں کشتۂ انداز ہوں یارب کس کا
حور آئی مجھے لینے کو قضا کے بدلے

تیر سے، تیغ سے، خنجر سے، سناں سے مارا
کئی پہلو مرے قاتل نے قضا کے بدلے

کفن اے گردِ لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے

عشق سے اللہ بچائے وہ مرض ہے فانیؔ
زہر بیمار کو دیتے ہیں دوا کے بدلے

فانی کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی
لے خوابِ محبت کی تعبیر نظر آئی

پھر ابر میں وحشت کی تصویر نظر آئی
لہرائی ہوئی بجلی زنجیر نظر آئی

جب میں نے دعاؤں کا رُخ سوئے فلک دیکھا
تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی

جو دل سے نکل آئی وہ آہِ سناں نکلی
جو ڈوب گئی دل میں وہ تیر نظر آئی

ہر عیش کی محفل میں پروانہ کا ماتم تھا
جو شمع نظر آئی دلگیر نظر آئی

کعبے میں کلیسا میں ہم نے تو جہاں دیکھا
اے قصرِ وفا تیری تعمیر نظر آئی

جب خون ہوا دل کا وہ آنکھوں میں آ بیٹھے
آہوں کا حجاب اُٹھا تاثیر نظر آئی

کایا غمِ دنیا کی وحشت نے پلٹ دی ہے
خاکِ رہِ ویرانہ اکسیر نظر آئی

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

دل اُن کے نہ آنے تک لبریزِ شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

فانی غمِ ہستی نے زندہ ہی مجھے سمجھا
جب تک مرے مرنے میں تاخیر نظر آئی

جنسِ دل مفت پھنا کر کوئی دیوانہ بنے
زلفِ جاناں سے بنا ہے کبھی سودا نہ بنے

اے تری شان کہ بتخانہ تو کعبہ بن جائے
دل کہ مسکن ہے ترا کعبہ سے بُتخانہ نہ بنے

لب تک آجائے غمِ ہجر تو شکوہ ہو جائے
آپ سُن لیں تو عجب کیا ہے کہ افسانہ بنے

دل کی لگی نہیں تو خیر اب کوئی دل لگی سہی
فتنۂ شامِ غم کے بعد فتنۂ حشر ہی سہی

نازِ خیالِ یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے
نغمۂ آرزو سُنا نغمۂ یاس ہی سہی

شیوۂ عاشقی نہیں ہجر میں آرزوئے مرگ
ہاں نہیں زندگی عزیز موت ہی زندگی سہی

ہر چند کہ ہے لیکن ملتا ہے نشاں کوئی
پہلو میں تجھے ڈھونڈھے اے دردِ نہاں کوئی

یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اُس نے کہا کہیے
تو چپ ہیں کہ کیا کہیے کھلتی ہے زباں کوئی

برگشتہ مقدّر کی تاثیر ارے توبہ!
دل ہی پہ پلٹ آئی کی آہ جہاں کوئی

شبابِ عشق کی فی الجملہ یادگار ہوئی
جو عمر صرفِ تماشائے حسنِ یار ہوئی

حسابِ حسرتِ حرمِ نظارہ دل سے پوچھ
نظر تو ایک جھلک کی گناہگار ہوئی

بساطِ عجز میں ایک آہ تھی متاعِ حیات
سو وہ بھی صرفِ ستمہائے روزگار ہوئی

بقدرِ مستیٔ دل ہے خمارِ غم بدنام
خزاں خراب باندازۂ بہار ہوئی

نہیں کہ آہ میں تاثیر ہی نہیں لیکن
یہ دل فگار کبھی آسماں فگار ہوئی

کرم ہے رازِ امیدِ کرم کی ہستی کا
امید تیرے کرم کی امیدوار ہوئی

بلا سے ہجر میں جینے کی انتہا تو ہے
وہ ایک بار ہوئی یا ہزار بار ہوئی

ازل میں خلق ہوئی تھی جو بجلیوں کی طرح
تری نگاہ مری جان بیقرار ہوئی

مرے وجود کی حجت مگر عدم کی دلیل
وہ ایک نظر تھی جو شاید جگر کے پار ہوئی

بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہار ہوئی

امیدِ مرگ پہ فانیؔ نثار کیا کیجے
وہ زندگی کہ ہوئی بھی تو مستعار ہوئی

جب دل میں ترے غم نے حسرت کی بنا ڈالی
دُنیا مری راحت کی قسمت نے مٹا ڈالی

اب برقِ نشیمن کو ہر شاخ سے کیا مطلب
جس شاخ کو تاکا تھا وہ شاخ جلا ڈالی

اظہارِ محبت کی حسرت کو خدا سمجھے
ہم نے یہ کہانی بھی سو بار سُنا ڈالی

جینے بھی نہیں دیتے مرنے بھی نہیں دیتے
کیا تم نے محبّت کی ہر رسم اُٹھا ڈالی

جینے ہیں نہ اب فانی مرنے میں شمار اپنا
ماتم کی بساط اُس نے گیا کہہ کے اُٹھا ڈالی

اب انہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دُلہن بن کے شباب آتا ہے

ہجر میں بھی مجھے امدادِ اجل تھی درکار
میری تربت پہ نہ آ تجھ سے حجاب آتا ہے

دیدِ آخر ہے اُلٹ دیجئے چہرے سے نقاب
آج مشتاق کے چہرے پہ نقاب آتا ہے

کس طرف جوشِ کرم تیری نگاہیں اُٹھیں
کون محشر میں سزاوارِ عتاب آتا ہے

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
کہ جنازہ پہ وہ غارت گرِ خواب آتا ہے

دل کو اس طرح ٹھہر جانے کی عادت تو نہ تھی
کیوں اجل کیا مرے نامے کا جواب آتا ہے

جلوہ نیرنگ ہے نیرنگِ تقاضائے نگاہ
کوئی مجبورِ تماشائے سراب آتا ہے

ہو گیا خون ترے ہجر میں دل کا شاید
اب تصوّر بھی ترا نقش بر آب آتا ہے

ملتی جلتی ہے مری عمرِ دو روزہ فانیؔ جی بھر آتا ہے اگر ذکرِ حباب آتا ہے

قطرہ دریائے آشنائی ہے
کیا تری شانِ کبریائی ہے

تیری مرضی جو دیکھ پائی ہے
خلشِ درد کی بن آئی ہے

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا
نارسائی سی نارسائی ہے

کون دل ہے جو دردمند نہیں
کیا ترے درد کی خدائی ہے

موت آئی ہے تم نہ آؤ گے
تم نہ آئے تو موت آئی ہے

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے
کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

ترکِ امید بس کی بات نہیں
ورنہ اُمید کب بر آئی ہے

مژدۂ جنتِ وصال ہے موت
زندگی محشرِ جدائی ہے

آرزو پھر ہے درپئے تدبیر
سعیٔ ناکام کی دُہائی ہے

موت ہی ساتھ دے تو دے فانیؔ
عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

کیوں نہ نیرنگِ جنوں پر کوئی قرباں ہو جائے
گر وہ صحرا کہ بہار آئے تو زنداں ہو جائے

برق دم لینے کو ٹھہرے تو رگِ جاں ہو جائے
فتنۂ حشر مجسّم ہو تو انساں ہو جائے

جوہرِ آئینۂ دل ہے وہ تصویر ہے تو
دل وہ آئینہ کہ تو دیکھ کے حیراں ہو جائے

غم وہ راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں
دم وہ مشکل ہے کہ موت آئے تو آساں ہو جائے

عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا
عقلِ مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے

ذرّہ وہ رازِ بیاباں ہے جو افشا نہ ہوا
دشتِ وحشت ہے وہ ذرّہ جو بیاباں ہو جائے

غمِ محسوس وہ باطل جسے کہتے ہیں مجاز
دل کی ہستی وہ حقیقت ہے جو عریاں ہو جائے

خلد مے خانے کو کہتے ہیں بقولِ واعظ
کعبہ بت خانے کو کہتے ہیں جو ویراں ہو جائے

سجدہ کہتے ہیں درِ یار پہ مر جانے کو
قبلہ وہ سر ہے جو خاکِ رہِ جاناں ہو جائے

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن فانی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

اے کاش شہادت کے ارمان نکل جاتے
قاتل کی نگاہوں کے تیور ہی بدل جاتے

آتے وہ تو فرقت کے دکھ کیا ہیں اجل کیسی
آئی ہوئی ٹل جاتی آتے ہوئے ٹل جاتے

سر اب مجھے بھاری ہے صدقہ ترے خنجر کا
یہ بار اتر جاتا جو وار کیے چل جاتے

جس قدر چاہیے جلوے کو فراوانی دے
ہاں نظر دے تو مجھے فرصتِ حیرانی دے

ترجمانِ غمِ دل رنگِ شکستہ ہے نہ آہ
کون اس عہد میں اب دادِ زباندانی دے

وحشتِ تازہ کا نوروز مبارک اے عشق
پھر بہار آئی مجھے خلعتِ عریانی دے

پھر تجھے زحمتِ درباں نہ مجھے شکوۂ غیر
میری قسمت کو جو تو خدمتِ دربانی دے

خلقتِ درد سے کم مایۂ غم ہیں محروم
جنسِ حرماں کو خدا عزتِ ارزانی دے

ہے ہوس ہوش تو اس ہوش سے میں باز آیا
کاش پھر بےخودی مژدۂ نادانی دے

اپنے دیوانے پہ انعامِ کرم کر یارب
در و دیوار دے اب نہیں ویرانی دے

سن کے افسانۂ غم پھر متبسم ہو جا
گریۂ شوق کو پھر دعوتِ طغیانی دے

رہ نہ جائے کہیں دشواریٔ فانی باقی
اس کی مشکل کو بھی اب رخصتِ آسانی دے

ہر چند کچھ اور ہے حقیقت   کہنے کو جو ہیں نہیں وہ تو ہے
کیا کیجئے نیرِ باغِ عالم   گل پردہ نشینِ رنگ و بو ہے

اللہ رے تری فسوں نوازی
جو دل ہے طلسمِ آرزو ہے

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لئے ہوئے
ذرے ہیں ایک جہانِ حقیقت لئے ہوئے

دے اذنِ عام عشق کو تاراجِ ہوش کا
بیٹھا ہوں دل میں صبر کی دولت لئے ہوئے

محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

اس خاکدانِ تیرہ میں کیا ڈھونڈھتا ہوں میں
پھرتا ہوں شمعِ داغِ محبت لئے ہوئے

کافر ہوں گر یقیں نہ ہوں کافر کی بات کا
وعدے ہیں اعتبارِ قیامت لئے ہوئے

روشن ہوئی وہ گورِ غریباں میں شمعِ طور
آغوشِ نور میں مری تربت لئے ہوئے

وہ مشقِ خوئے تغافل پھر ایکبار رہے
بہت دنوں مرے ماتم میں سوگوار رہے

خدا کی مار جواب دل پہ اختیار رہے
بہت قرار کے پردے میں بیقرار رہے

کسی نے وعدۂ صبر آزما کیا تو ہے
خدا کرے کہ مجھے تابِ انتظار رہے

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ارے توبہ
کوئی مزار میں کوئی سر مزار رہے

سکونِ موت مری لاش کو نصیب نہیں
رہے مگر کوئی آشنا نہ بے قرار رہے

میں کب سے موت کے اس آسرے پہ جیتا ہوں
کہ زندگی مرے مرنے کی یادگار رہے

جو دل بچا نہ سکے جان کیا بچا لیں گے
نہ اختیار رہا ہے نہ اختیار رہے

میں غم نصیب وہ مجبورِ شوق ہوں فانیؔ
جو نامراد جیئے اور امیدوار رہے

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے
ہیں جو روپا مسکرا کر رہ گئے

یا ترے محتاج ہیں اے خونِ دل
یا انہیں آنکھوں میں دریا بہہ گئے

موت ان کا منہ ہی تکتی رہ گئی!
جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

تو سلامت ہے تو ہم اے دردِ دل
مر ہی جائیں گے جو جیتے رہ گئے

پھر کسی کی یاد نے تڑپا دیا،
پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے

اُٹھ گئے دُنیا سے فانیؔ اہلِ ذوق
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

اس نورِ مجسّم کے افسانے کو کیا کہیے
ہے شمع بھی پروانہ پروانہ کو کیا کہیے

ہر در سے ترے طالب ناکام پلٹ آئے
کعبے میں ہے سناٹا بتخانے کو کیا کہیے

کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانے کا جل بجھنا
جل کر نہ بجھے ایسے پروانے کو کیا کہیے

آغاز بھی تو جس کا انجام بھی تو جس کا
اُس دردِ محبّت کے افسانے کو کیا کہیے

آبادی کی آبادی ویرانے کا ویرانہ
ارمان بھرے دل کے کاشانے کو کیا کہیے

اُجڑی ہوئی آنکھوں میں رونق ترے دم سے تھی
ویران ہے ہر بستی ویرانے کو کیا کہیے

کس نے اسے دیکھا ہے اے حسرتِ نظّارہ
فانیؔ تو ہے دیوانہ دیوانے کو کیا کہیے

رگ رگ میں اب اندازِ بسمل نظر آتا ہے
ہر سانس کے پردے میں قاتل نظر آتا ہے

وہ وعدۂ آساں پر مائل نظر آتا ہے
اب کارِ تمنّا پھر مشکل نظر آتا ہے

تو دشنہ و پہلو میں حائل نظر آتا ہے
جیتے ہیں کہ مرجانا مشکل نظر آتا ہے

ترکِ غمِ ساحل کا حاصل نظر آتا ہے
لے ڈوبنے والے وہ ساحل نظر آتا ہے

دل کھوئے ہوئے برسوں گزرے ہیں مگر اب بھی
آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے

آغازِ محبت میں جینے ہی کے لالے تھے
اب خیر سے مرنا بھی مشکل نظر آتا ہے

تو مستِ خود آرائی ہم حسن کے متوالے
جو ہے تری محفل میں غافل نظر آتا ہے

رودادِ محبت کی تصویر ہے ہر آنسو
ہر قطرۂ خونیں میں اک دل نظر آتا ہے

بے تابیٔ بے صرفہ بے وجہ نہیں یعنی
دل دردِ محبّت کے قابل نظر آتا ہے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانیؔ
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

مشتاق نگاہوں کی اللہ رے رسوائی
میں محوِ تماشا ہوں دُنیا ہے تماشائی

تیری ہی نگاہوں کے سب دیکھنے والے تھے
تقدیر بگڑ بیٹھی تدبیر نہ کام آئی

بیداد کے اس تیور اس حُسن کے میں صدقے
اُن کو مرے مرنے پر آئی تو ہنسی آئی

لبریز متوجّہ تھا اک اک خطِ پیمانہ
محفل سے جو وہ اُٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

پھولوں سے تعلّق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

کترے ہیں یہ گل تیری اک جنبشِ دامن نے
یوں گرنہ لٹے پیدا وہ پھول بھی گلشن نے

بجھتا جو شرف اُن کے اُڑتے ہوئے دامن نے
اُٹھ اُٹھ کے بلائیں لیں خاکِ سرِ مدفن نے

جو مجھ پہ ہوئی ایسی بیداد نہ کی ہوگی
اللہ کے بندوں پر اللہ کے دشمن نے

وہ قصّۂ موسیٰ پھر اے سوزِ جگر کہنا
کس آگ کی چنگاری دی وادیٔ ایمن نے

یہ سوختہ سامانی کس کس کے نہ کام آئی
لی ایک نہ اک بجلی ہر دانۂ خرمن نے

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

یہ رشک و محبت کی روداد ہے آفاقیؔ
اک دوست کے پردے میں مارا مجھے دشمن نے

متفرق اشعار

کیا بلا تھی ادلئے پُرسشِ یار — مجھ سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
وہ قیامت اُٹھائے پھرتے ہیں — آسماں آج زیرِ پا نہ ہوا

آہ نیوں پر دل کیا آیا ہاتھ ہی سے نادان گیا
خیر بلا سے دل ہی جاتا جان گئی ایمان گیا

ہے نشانِ عبودیت مصروفِ دعا ہونا — منظورِ مشیت تھا ہر نالہ رسا ہونا
بنیادِ جہاں کیا ہے مجبورِ فنا ہونا — سرمایۂ ہستی ہے محرومِ بقا ہونا

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار — زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

آ کے تماشا گاہِ جہاں میں دادِ تماشا کیا چاہوں
یاں ہر ذرہ کہتا ہے میں ذرہ نہیں اک دنیا ہوں

محوِ تماشا ہوں میں یارب یا مدہوشِ تماشا ہوں
اس نے کب کا پھیر لیا منہ اب کس کا منہ تکتا ہوں

شب گریۂ غم کے طوفاں کا وہ جوش دہ جوش ارے توبہ
ہر اشک امڈ کر کہتا تھا میں دل کے لہو کا دریا ہوں

سازِ ہستی کو بس اب قسم کے اشارے سے نہ چھیڑ
اس میں ٹوٹے ہوئے دل کی نہ ہو آواز کہیں

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

کہتے ہیں یہاں حضرتِ فانیؔ تو نہیں ہیں
اس انجمنِ ناز میں کیا ہم بھی کہیں ہیں

گو ہستی تھی خوابِ پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی
چونک اُٹھے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

مجھے مرنے کی مسرت کار مشکل کی تمنا ہے
مرادم بھی کسی ناکام کے دل کی تمنا ہے
اجل سے ہے دلِ مایوس کو امید آسائش
مری ڈوبی ہوئی کشتی کو ساحل کی تمنا ہے

دیکھ فانی وہ کوئی حشر اٹھاتا آیا
چونک اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے

ہے جو اس کانِ ملاحت سے طلبگار نمک
زخم دل شاید تبسّم آفریں ہونے کو ہے
اللہ اللہ سرخیٔ رنگ شفق کیوں کے نہ ہو
آسماں کیا کوئے قاتل کی زمیں ہونے کو ہے

مطلب ہے ضبطِ عشق سے تاثیرِ دردِ عشق
اخفائے حال سے غرض افشائے حال ہے
رودادِ مرگِ زیست یہ ہے قصہ مختصر
مجبور زندگی کو بھی جینا محال ہے

روح کا آنسوؤں بھری آنکھوں میں ہاتھ ہے
آ کہ حیاتِ مستعار نقش بروئے آب ہے

قاعدہ دانِ ضبط ہے شعلۂ غم کی داد دے
برق کی وضع پر نہ جا بندۂ اضطراب ہے

اے داغِ دل لے کھوئے ہوئے دل کی نشانی
آ فنائی بیدل تجھے سینہ سے لگا لے

عالم ہستی یارب کیا آباد نما ویرانہ ہے
جس نے یہاں کچھ ہوش سنبھالا اس ق وہی دیوانہ ہے
کس کو یہاں امیدِ اثر ہم دل سمجھا لیتے ہیں
حالِ دل اس سے یوں کہتے ہیں گویا ایک فسانہ ہے

میں بھی ایک پرتوِ ہستی ہوں مگر کیا کہیئے
قطرہ دریا سہی کس قطرے کو دریا کہیئے
تھی نظر صرفِ تماشا وہ زمانہ گذرا
اب کوئی دن مری آنکھوں کو تماشا کہیئے

ڈوگمگا گئی ہے جب سے نظر کی مستی   بیہوش مستقل ہے اس رہگذر کی بستی

غزلیاتِ فارسی

ساقی خمے از بادۂ دوشینہ چہ جام است
زخمے است مرا در دل و مرہم نہ حرام است

خوں گشتہ ہدف، انگار، کہ قاتل نہ شناسم
دانم کہ ادائیست و ندانم کہ کدام است

از جلوتیاں، لذتِ عیش نگہے پرس
بر خلوتیاں، فرصتِ نظارہ حرام است

دم در کش و دل خوں کن و ہر قطرہ بجوش آر
از نالہ، مجو کام کہ این شیوۂ عام است

در مسلکِ ما، لغزشِ پا، خضرِ طریق است
از میکدہ، تا کعبۂ کوئیش، دو سہ گام است

نازم چمنے راکہ نیاز م بہ قفس نیست
ہر غنچہ کہ دل می کشدم، حلقۂ دام است

فانیؔ ز حیاتِ منِ آشفتہ، چہ پرسند
مرگیست، کہ از ہستیِ جاوید پیام است

ز حسن و عشق، چہ گویند، داستانِ من است
غمِ تو جانِ من است و، وفا جہانِ من است

شرارِ برق کجائی، کہ گوشۂ قفسم
بہ التفاتِ تو ارزد، کہ آشیانِ من است

نیافتم ز حرمیش نشان و نوبتِ کار
بدل رسید و ہماں سنگ آستانِ من است

ز حدِ خویش گزشتن بحدِ خویشم برد
ہر آں نشاں کہ بدانش وہم نشانِ من است

ز لطفِ دوست مرا، نیمہ نگاہ بس است
متاعِ خلد بجویم، کہ رائگانِ من است

بہ غربتم کہ بہر قریہ ام وطن پیدا ست
بہر زمیں کہ شدم زیرِ آسمانِ من است

بہ رنجِ خستگیم بخش و از گناہ مپرس
بگو کہ فانیِ عاصی ز خستگانِ من است

خاکِ پائے بندگانِ درگہِ عشقیم ما — ہر کجا صیدے بدامِ اوست صیادِ من است
می ندانم تا بہ محشر اعتبارِ سجدہ چیست — اینقدر دانم کہ ہیچ است و جبین را دامنِ است

افشاندنِ جاں جز بحضورِ تو روا نیست — در عہدِ غمِ ہجرِ تو آئینِ فنا نیست
نازم بجمالِ تو کہ برق است و بلا نیست — سازم بہ غمِ عشق کہ درد است و دوا نیست
غیب است شہودم ز دیارِ دگر استم — عالم عدمِ ماست کہ از عالمِ ما نیست
کونین بما عرضہ نمودند و ندیدیم — آغوشِ فضائے کہ بہ سودائے تو وا نیست
ناخواستہ جاں بخشی و نادادہ ستانی — فارغ زغمِ سیم و حاجت بدعا نیست
بگزار قفس را کہ بہ پرواز در آید — دارم سخنے با گل و راہم بہ صبا نیست
خواہانِ کرم نیست پرستارِ کریم است
فانی بدرت ناصیہ فرساست گدا نیست

نور ز صبحِ وصال بختِ سیاہم ربود　　جلوۂ ناگاہِ دوست تابِ نگاہم ربود
برقِ جمالش ز دل صبر بہ تاراج کرد　　آنچہ ازو باز ماند شعلۂ آہم ربود
شکوۂ بختم چراست کامِ دلم چوں دہد　　ناشدہ شامِ وصال ہم پگاہم ربود
محرمِ راز است و ہم رفتۂ راز است دل　　گاہ رُبا بودم و مستیِ گاہم ربود
خیرِ عمل را مسنج باز بسعیم بہ بخش　　عزمِ حرم داشتم دَیر ز راہم ربود
از دلِ فانی چہ گفت گفت کہ ما بُردہ ایم
باز ز جاں گفتمش، گفت کہ خواہم ربود

فتنۂ عشق بدلہا سر زند　　حسنِ عالم بہ تماشا ار زند
طالعم گردشِ افلاک بسوخت　　اخترِ مارہ صد اختر زند
غمِ او خونِ دل از اشکم ریخت　　نشتر آورد و رگِ گوہر زند
عندلیبے کہ نوایش دادند　　بہ ہوائے چمنِ ما پر زند
مغفرت حیلہ تقاضا می کرد　　رحمتش قرعہ بہ چشمِ تر زند
شررِ عشق کہ شعرش نامند　　ز دلم جست و بہ جا نہا در زند
فانی از دیر و حرم ہم بگسست
دوش دیدم کہ درِ دیگر زند

بازِ خاطرِ شادم تلخیِ غم از من پرس — حرفِ عیش بربادم شوخیِ رم از من پرس
خامہ را زباں ہستم، لوح را نشاں ہستم — حرفِ کن فکاں ہستم رازِ عالم از من پرس
محرمِ مثالم من نکتہ دانِ حالم من — رہ مے ہم از من جو، خلد را ہم از من پرس
نعمتے است عیش اما نعمتے و پایانے — نعمتے است بے پایاں لذتِ غم از من پرس

حُسنِ بے تماشا را عشوہ ہا تو میدانی
چشمِ بے تماشا را اشکِ پیہم از من پرس

بے خبر از تو چو اغیار ہمنے ساختہ ام — سخنے ساختہ اند و سخنے ساختہ ام
حسن یک پرتوِ عقفتے است کہ از ما خیزد — صنمے ساختہ ام برہمنے ساختہ ام
دہر خلوت گہِ اسرار ہمانست ولے — از پئے دفعِ نظر انجمنے ساختہ ام
نقشہا بستہ ام از خونِ شہیدانِ چمن — ورقِ لالہ ز خونیں کفنے ساختہ ام
گنہے کردہ ام و عذرِ گنہ می بایست — حیلہ پرداختہ ام، اہرمنے ساختہ ام

ایں خطا نیست کہ عفوم نکندش فانی
کہ من از خاکِ بدایوں وطنے ساختہ ام

برگِ گلے واشک شرحِ عذابے نوشتہ ایم
رازِ لیست آتشے کہ بہ آبے نوشتہ ایم

ایں فتنۂ جمال کہ گویند عالمے است
فصلے ز اعتبارِ حجابے نوشتہ ایم

یارب بہ نامۂ عملم خوردہ مگیر
فرہنگِ حرفِ ہوش بہ خوابے نوشتہ ایم

مُہرِ فنا بہ لب نہ دم و دیدہ دوختیم
آدابِ انتظارِ جوابے نوشتہ ایم

از راحتِ زمانہ جراحت عبارت است
آبے نوشتہ اند و سرابے نوشتہ ایم

داغے بدل سپردم و دوزخ بجانِ داغ
تاریخِ روزگارِ شبابے نوشتہ ایم

فانی دریں صحیفۂ امکاں بنامِ تو
ہر جا کہ ہست خانہ خرابے نوشتہ ایم

[illegible] را بہ نیم جنبشِ مژگاں فروختیم
دیوانہ معنتِ تست کہ ارزاں فروختیم

[illegible]یتِ گرمیِ بازارِ گل مپرس
جیبے کہ داشتیم بداماں فروختیم

[illegible] از آنِ ماست بے سر و سامانی کہ ہست
[illegible]قِ بے سر و ساماں فروختیم